

W o m e n W r i t e r s  
C l a s s i c s



افانے

لیاون

عصمت چشتانی

RHOTAS L P S  
L O W P r i c e d S e r i e s

لحاف

افانے

حصہ ت پختائی

روہتاس بکس

## جملہ حقوق محفوظ

۱۹۹۲ء

اشعاعت اول

نیمس پر نظرز پینکا - کراون لائبرر

پر نظرز

روہتاں بکس احمد جیہی دی - نیپل روڈ لاہور

پبلشرز

Rs.

# کاف

## ترتیب

5	زندگی	●
18	کاف	●
29	پیشہ	●
41	تل	●
56	بکار	●
67	دال	●
84	تبرا	●
102	تمیری	●

## زندگی

جب میں اپنی زندگی کا سب سے پہلا منظر یاد کرتی ہوں تو لال لال شیشوں والا ایک گول چمکیلا کمرہ آنکھوں کے سامنے گھونٹنے لگتا ہے، جہاں میں تالیاں بجاتے ہوئے پھرا کرتی تھی۔ یہ شیش محل میری ماں کا پیٹ تھا۔ جو اس کرے کی محل میں مجھے ابھی بھی کبھی کبھی دکھائی دیتا ہے۔ پھر ایک اور دائرہ یاد آتا ہے جس کے اندر زرق برق لباس پہنے میں کھڑی ہوں اور لوگ میرے ارد گرد گھوم رہے ہیں۔ بات یوں تھی کہ میں اپنے ماں کی شادی میں ناج رہی تھی۔ لوگ کھڑے تھے جو مجھے گھومتے دکھائی دے رہے تھے۔ آج بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ سب گھوم رہے ہیں، اور میں کھڑی ہوں۔

ہمارے گھر میں ایک سفید گھوڑی تھی۔ میرے بھائی اس پر پاری پاری سیر کرتے۔ سائیں انہیں گھما کر لاتا۔ میں للچائی نظروں سے انہیں دیکھتی اور گھوڑی پر چڑھنے کی ضد کرتی۔ لیکن ماں کی اجازت نہ تھی۔ وہ کہتیں (لڑکیاں گھوڑا سواری نہیں کرتیں) گھوڑی پر چڑھی تو نانگمیں توڑ دوں گی۔ لیکن جب میں اپنے کسی بھائی کو سفید گھوڑی پر اکڑ کر بیٹھنے ہوئے دیکھتی تو محل انٹھتی۔

ایک بار میں گھوڑی کے پیچھے روئی ہوئی جا رہی تھی۔ بھائی گھوڑی پر شان سے بیٹھا تھا۔ اسی وقت میرے والد کھڑی سے لوٹے۔ سائیں سے انہوں نے پوچھا۔ ”یہ کیوں رو رہی ہے؟“

اس نے بتایا: ”گھوڑی پر بیٹھنا چاہتی ہیں۔“

”جی بیگم صاحبہ کی اجازت نہیں ہے۔“

ابانے کہا۔ ”بٹھاؤ۔“

تب سے میں بھی روز سفید گھوڑی پر بیٹھنے لگی۔ گھوڑی پر بیٹھ کر مجھے اپنی فتح

مندی کا بے پناہ احساس ہوا۔ باغی نصمت کی پہلی فتح تھی۔ اس کے بعد تو والد جب بھائیوں سے نشانہ لگواتے تو میرے ہاتھ میں بھی کارتوں تھما دیتے اور نشانہ لگانا سکھاتے۔ میں دسویں اولاد تھی۔ میرے پیدا ہوتے ہی بچوں میں ماں کی دلچسپی کم ہو گئی۔ مجھے یا تو آیا دیکھتی یا میری باجی لیکن آیا بھی دو تین سال بعد چلی گئی آیا کا دوسری طرف منہ کئے ہوئے ایک خاص انداز مجھے اب تک یاد ہے جس میں اس کے ہرے ہرے گود نے صاف دکھائی دیتے تھے۔ باجی مجھے بت سنبھالتی تھیں۔ میں سارا سارا دن ان کی نانگوں میں لٹپٹی اپنے آپ کو محفوظ سمجھتی رہتی۔ اماں تو شاید مجھ سے نفرت ہی کرتی تھیں ہر دو سال بعد ان کے بچہ ہو جاتا تھا۔ بھلا ہو اس بندر کا جس نے ان دنوں فیملی پلانگ کا کام کیا۔ ہوا یوں کہ اماں پورے دنوں سے تھیں۔ اپنے ہبیث پر کھوری نکائے وہ چنے کھا رہی تھیں۔ درخت پر بیٹھے ایک موئے تازے بندر کا بھی چنے کھانے کا جی چاہئے لگا۔ اس نے اوپر سے ماں کے ہبیث پر چھلانگ لگائی۔ اس کے ماں کا حمل ضائع ہو گیا اور اماں کے پھر کبھی بچہ نہ ہوا۔ میں چار برس کی تھی کہ باجی کی شادی ہو گئی۔ لمبے سے سوکھے سے دو لہاجن کی سرے کی لڑیاں نوج لینے کو جی چاہ رہا تھا، باجی کو لے گئے۔ وہ تھانیدار تھے۔ گھر بھر میں چھوٹے بڑے سب مجھے چڑھاتے۔

باجی کے بچھوئے دانیدار

باجی کو لے گیا تھا تھانیدار

میں بینڈ باجے کے شور میں اپنی رلائی کو گم ہوتے ہوئے دیکھتی رہی۔ باجی ٹھیک گئی۔ اتنے ہنگامے میں ایک بچی کا روٹا ب سورتا کیا اہمیت رکھتا ہے۔ ان دنوں کبھی بھی خوابوں میں مجھے اندھیری خالی سڑک پر روٹی ہوئی دھیرے دھیرے آگے بڑھتی ایک چھوٹی لڑکی دکھائی دیا کرتی تھی۔ وہ میں ہوتی تھیں۔

مجھے میں اور باقی بہنوں میں عمر کا بڑا فرق تھا۔ وہ سب ایک کونے میں گچھا بن کر اپنے ہونے والے دلوں کا ذکر کرتی تھیں، مجھے دیکھتے ہی بھگا دیتیں۔ بھائی لوگ اپنے کھیل کو دی میں مست رہتے تھے۔ میں بغیر پارٹی کے تھی یعنی آزاد۔ کوئی بھی مجھے اپنی پارٹی کے دائرے کے قریب نہ پہنچنے دیتا۔

دھیرے دھیرے میری بمحہ میں آنے لگا کہ بہنوں کی طرح سرجوڑ کر لفصول  
باتیں کرنے سے امرود کے درخت پر چڑھنا زیادہ مزیدار ہے، گھر میں بینٹھ کر باورچی  
خانے میں نوکروں کے سرید کھڑے رہنے سے بندر کا تماشا زیادہ دلچسپ ہے۔ اور  
شادی کے لئے تیار ہونے والے جیز میں سر کھپانے سے مرغیوں کے پیچھے دوڑنا  
زیادہ آسان ہے۔ میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا، جس پر آج تک چل رہی ہوں،  
گھر میں کس کو اس بات کی فکر تھی کہ میں کیسے بڑی ہو رہی ہوں۔ میں اپنے  
بھائیوں کے ساتھ وہ بھی کھیل کھیلتی جو لڑکے کھیلا کرتے تھے۔ گلی ڈنڈا، پنگ بازی  
اور نرٹ بال کھیلتے کھیلتے میں بارہ برس کی ہو گئی۔ تب تک میں نے پڑھنے کے نام  
تک قرآن شریف ختم کر لیا تھا۔ شabaشی دینے کے بجائے سب کرنے لگے، اے ہائے  
اتنی بڑی ہو گئی اور قرآن اب ختم کیا۔ انہیں کی بھانجی ہے دیکھئے، پیرخ برس کی ہے  
قرآن بھی ختم کر لیا اور سینا پروٹا سب جانتی ہے۔ یہ بھانجی میری بڑی آپا کی لڑکی  
تھی۔ آپا یوہ ہو گئی تھیں، یاد آیا۔۔۔۔۔۔ ایک بار گھر تار آنے کا کرامہ مج گیا تھا۔ پڑھ  
چلا، دو ما بھائی چل بے۔ میں بڑی خوش ہوئی کہ اب باجی واپس آ جائیں گی۔ اب  
پھر راتوں میں اندر ہر سڑک پر وہ چھوٹی لڑکی مجھے دکھائی نہ دے گی۔ لیکن معلوم  
ہوا یہ بڑی بمن کے شوہر تھے، جن کا انتقال ہو گیا تھا، لیکن اللہ میاں کو مجھ سے کیا  
مطلوب! بارہ سال کی ہوئی تو ایک دن اماں نے ہاتھ میں پرانے غارے کی گوٹ نکال  
کر دیدی۔ سوئی دھاکہ تھا کہ کما کہ اس کا کمر بند سیو۔ ہاتھ کھل جائے گا۔ جب  
تک اماں سر پر کھڑی رہتیں، تو دم گھستا ہوا محسوس ہوتا۔ مرغیاں دوڑاتے یا پیڑوں پر  
چڑھتے بھائی دکھائی دیتے اور ہاتھ میں سوئی چبھ جاتی۔ اماں کو گھر میں بہت کام ہوتے  
تھے۔ ان کے جاتے ہی میں ساری گوٹھ بند رضاویوں میں گھسا دیتی۔ جب کبھی  
سردیوں میں بستر کھلتے تو نظر آتی۔

پھر مان نے کھانا بنا کھانا سکھانا چاہا۔ میں نے کہا۔

”میں تو نہ سکھوں گی۔“

اماں نے پوچھا۔ ”کیوں نہ سکھوں گی؟“

میں نے کہا ”شہزاد بھائی کیوں نہیں سکھتے؟“ ماں نے کہا ”اس کی

یوی آئے گی، وہ کھانا بنائے گی۔“

میں نے کہا ”اگر ان کی یوی مر گئی یا بھاگ گئی تو کون بنائے گا؟“

شہزاد بھائی رونے لگئے کہ میری یوی کو کیوں بھاگ رہی ہے؟ تبھی ابا آمگئے۔

ساری بات سن کر انہوں نے بڑے پیار سے مجھ سے کہا ”کھانا تو عورتیں بناتی ہیں، سرال جا کر، نہیں کیا کھلاؤ گی؟“ میں نے جواب دیا۔ ”دولہا غریب ہوا تو کچھزی بنائے کھالیں گے اور اگر امیر ہوا تو باورچی بنائے گا۔“

ابا نے اسی وقت سمجھ لیا۔ اس بھوتی کا ہم کچھ نہ بگاؤ سکیں گے۔

انہوں نے پوچھا۔ ”کیا کرو گی پھر تم؟“

میں نے کہا۔ سمجھی بھائی پڑھتے ہیں۔ میں بھی پڑھوں گی۔“

تب میرے ماں میں بھر تک سمجھے گھر پڑھاتے رہے اور اس ایک صینے میں صبح و شام میں نے اتنا پڑھا کہ اسکوں میں چونھی جماعت میں لے لی گئی۔ اس کے بعد ڈبل پر دوشن ملا اور میں چھٹی جماعت میں آگئی۔ میں آزاد رہنا چاہتی تھی اور تعلیم کے بغیر عورت کو آزادی نہیں مل سکتی جاہل عورت گھر میں بینخ کر میاں سے یو قوف، جاہل جیسے خطاب پائے گی اور میاں کے دفتر جاتے ہی گھر میں بینخ کر پھر اسی کا انتظار شروع کر دے گی۔ میں نے سوچا چاہے کچھ ہو جائے کسی سے دب کر نہیں رہوں گی اور جتنا ممکن ہو اپڑھوں گی۔

میں شادی نہیں کرتا چاہتی تھی۔ ہاں پڑوس کا ایک لڑکا پسند آگیا تھا۔ اس وقت میں بارہ یا تیرہ برس کی تھی۔ محبت تو اس عمر میں خود بخود لڑکی کے دل میں گھر کرنے لگتی ہے۔ وہ صاحب چھپیں یا ستائیں سال کے رہے ہوں گے۔ ہماری کوئی ختمی کے پاس ہی رہتے تھے۔ روز سوریے گھوڑا سواری کے لئے جایا کرتے تھے۔ اس وقت میں پابندی سے انہیں دیکھا کرتی تھی۔ انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا ہو گا کہ یہ چھوٹی سی ختمی منی ان پر دل و جان سے عاشق ہے۔ وہ بت خوبصورت تھے لیکن میری طرف کیوں دیکھتے؟ ان کی نظر اپنی عمر کی چھوٹ کری پر ہی رہی ہو گی۔ ہم صرف انہیں گھوڑے پر آتے جاتے ہی دیکھتے رہ گئے۔ پھر تھیں سال بعد بہی میں وہ شاہد لطیف کی ایک فلم کے سیٹ پر آئے۔ مجھے پہچانتے ہی گئے لگا

لیا۔ میں نے دل میں سوچا، ارے کم بخت اب کیا فائدہ؟ تیس سال پسلے گئے لگایا ہوتا اپنی دنیا میں کیا نہ ہو گیا ہوتا؟ تب تو ہمارا نوٹس نہ لیا۔ ہم دن تک اپنی بارہ تیرہ برس کی سنبھی مُتمنی جان محبت کی پھواروں سے بھر کر تم پر چھڑکتے رہے! اور اس وقت کے خوبصورت شنزادے کا خواب آج بھی مجھے رومانی کرتا ہے۔

کم بخت نے میرا بچپن ہی سکھا دیا۔

طالب علمی کے دنوں میں کئی لڑکے اچھے گئے، لیکن تمہارے تھوڑے دن ہی اچھے لگتے۔ جو بہت خوبصورت اور لاائق لڑکے تھے۔ ان پر تو لڑکیاں ہی مرتب تھیں۔ جو سوکھے مریل کرتے سے لڑکے تھے وہی لڑکوں کے پیچھے بھاگتے تھے۔ ایک بیساکی لڑکا بہت ہی خوبصورت تھا اس پر بہت لڑکیاں فدا تھیں۔ ہمارے ساتھ بھی اس کی دوستی تھی۔ لڑکیاں اس کے گھر جا کر ایک پیسری کھا آتی تھیں۔ ہمارے کانج میں تو صرف لڑکیاں ہی پڑھتی تھیں۔ جب کبھی کوئی لیڈر آتا۔ جیسے مولانا آزاد ہوئے، نسروتی آئے، وجہ لکھی پنڈت آئیں۔ ان کی تقریبیں یونیورسٹی میں ہوتی تھیں۔ اس وقت ہم لڑکوں کی یونیورسٹی میں جاتے تھے۔ ہال میں لڑکے شریفوں کی طرح پنجوں پر بیٹھے رہتے۔ باہر سڑک پر آتے ہی آوارہ ہو جاتے۔ سامنے کی پڑی پر چلتے چلتے گھنیا شعر اچھاتے، بلاوجہ ہنتے، یا ایک دوسرے پر گرتے پڑتے چلنا شروع کر دیتے۔ لڑکیاں پیچی نظر کئے اپنی پڑی کی طرف دیکھتے دیکھتے مشکل سے ہوشی پہنچتیں۔ اس ڈرامے میں مجھے بڑی کرفت ہوتی۔۔۔ استانیاں تو سمجھتی تھیں کہ ادھر لڑکوں نے لڑکوں سے بات شروع کی، ادھر لڑکے ریشہ خٹپی ہوئے۔ میں لڑکوں سے کہتی، یہ لڑکے ہم سے دوستی کرنا چاہتے ہیں، کھاتو نہیں جائیں گے، کیوں نہ ہم ان سے دوستی کر لیں۔ لیکن کوئی لڑکی میری بات سے متفق نہ ہوتی۔

بہر حال جب ہم تقریب سن کر ایک دن اپنی اپنی پڑیوں پر چل رہے تھے، ایک لڑکے نے بلند آواز میں شعرِ دعا تو میں نے اپنی پڑی سے جملہ اچھالا:

”کیوں بھی یہ جگر کا شعر ہے؟“

لڑکے نے دائیں بائیں دیکھا کہ یہ آواز کماں سے آئی؟ آواز تو زنانہ لگتی ہے۔ میں نے اپنا سوال دھرا یا۔ وہ ہکلا تا ہوا بولا ”معلوم نہیں۔“

میں نے پھر کہا ”خواہ مخواہ اندھیرے میں گوئی پھینک رہے ہو؟ ارے بھی، یہ داغ کا شعر ہے۔“ اس کے بعد میں نے لڑکوں سے کہا۔ ”دیکھو مجھے کسی نے کھایا نہیں۔ میں صحیح سلامت ہوں۔“

اس کے بعد کئی لڑکوں سے ہماری دوستی ہوئی۔ پڑھنے لکھنے کی، شاعری کی باتیں ہوتیں۔ ہاں تین چار لڑکیاں مل کر لڑکوں سے چائے وائے پی لیتیں۔ پہلے سے ہی سوچ کر جاتے، کیا کیا منگوائیں گے؟ سوڈا سموے، آلو کی نکیوں کا دور چلتا۔ لڑکوں کے گھروں سے جو آموں کے نوکرے آتے، مٹھائیاں آتیں، ان میں ہمارے لئے بھی حصہ رہتا۔ استانیاں خفا ہوتیں تو انہیں بھی ایک آدم دیدیا جاتا۔

ایک بار چھپیوں میں ہم گھر جا رہے تھے۔ لڑکے بھی ظاہر ہے اسی ژین میں تھے۔ جب کسی اشیش پر گاڑی رکتی تو تمام لڑکے ہمارے ڈبے کے سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے۔ ڈر کے مارے لڑکیاں چھو لے، بھورے اور نکیوں کی طرف دیکھتی رہ جاتیں۔ نیچے اُرکرکی کو خریدنے کی ہمت نہ ہوتی۔ پاس کے مارے برا حال تھا۔ میں نے سوچا یہ سفر تو بڑا بد مزہ رہے گا۔ اگلی دفعہ جب پلیٹ فارم پر گاڑی کھڑی ہوئی تو میں نے ایک لڑکے سے کہا۔

”ذردا دھر آؤ۔“

وہ کچھ سمجھا نہیں۔ میں نے دوبارہ اشارے سے بلایا۔ وہ ڈرتے ڈرتے کھڑکی کے پاس آیا۔

میں نے کہا۔ ”سوڈا لا دو گے۔“ بولا ”ضرور“ اور پلک جھکتے ہی سوڈے کی بوتل لَا کر میرے ہاتھ پر رکھ دی۔ پیسے لینے سے وہ انکار کرنے لگا۔

میں نے کہا ”بھی دو آنے کے لئے تمہارا احسان کیوں لوں۔ تم نے سوڈا لا دیا یہ کیا کم ہے؟“

جب گاڑی چلی تو نیچر مجھ سے بہت غصے ہوئی کہ کیوں لڑکوں سے سوڈا منگوایا؟ میں نے کہا ”اب کے آیا تو کھانا ہی منگوالوں گی، بات ہی تو کی ہے۔۔۔ بات کرنے میں کیا حرج ہے؟ اگلے اشیش پر ایک سوڈا آپ کو بھی منگوا دیں گے۔“ نیچر شاید ماہنذ کر گئیں۔ اگلے اشیش پر لڑکے پھر آئے جب جب پلیٹ فارم

آتا۔ ہم کچھ نہ کچھ منگو اہی لیتے۔ کافی بے تکلفی ہو گئی۔ سفر بھی خوب مزے سے کٹا۔ بچپن میں مجھے سوتے میں چلنے کی عادت تھی۔ دس بارہ برس کی عمر تک یہ عادت رہی۔ سوتے میں انٹھ کر کیسی بھی نسل جاتی۔ ایک بار کندھی کھول کر باغ میں چلی گئی۔ جب ہوش آیا تو ایک پیڑ کے پیچے کھڑی تھی۔ اسے ہم بھوتوں کا پیڑ کتے تھے۔ مجھے تو کوئی بھوت دوت دکھائی نہیں دیا۔ لیکن ماں نے سمجھا مجھ پر کوئی بلا ہے۔ انسوں نے درگاہ میں چڑھاوے چڑھائے۔ درگاہ کا کاؤنڈا بھوت بھگانے کے لئے میرے سر بر لگاتی۔ لیکن نہ بلا آئی نہ گئی۔ بلا کیا کھا کر بھلا میرا مقابلہ کرتی۔ جب میں نویں درجے میں تھی تو میری شادی کے پیغام آتا شروع ہو گئے تھے۔ ایک لڑکا ڈپٹی گلکشتر تھا۔ ماں نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ اپنی بھوتی لاکی میں اسی کو دوں گی۔ درزی سنار بھواریے گئے۔ ایک دن اسکول سے لوٹ کر میں نے چہل پہل دیکھی تو کچھ شبہ سا ہوا۔ اب کوئی اور بہن کنواری تو نہ تھی۔ پھر یہ ہنگامہ کیسا! سراغ لگانے سے پہلے چلا، یہ ہماری ہی شادی کی تیاریاں ہیں۔ میں تو گھبرا گئی۔ باری باری اماں ابا سے کہا۔

”میں شادی نہیں کروں گی، پڑھوں گی۔“

اماں بولیں: ”پاگل ہے۔“ ابا سمجھانے لگے۔ ”پڑھنے کو کون منع کرتا ہے! سرال میں جا کر پڑھ لیتا۔“ میں نے سوچا۔ سرال میں جا کر پڑھائی ہو چکی! ابا جیسا گلکشتر ہوا تو ہر سال پچھے پیدا کروں گی یا امتحان دوں گی؟

بہت سوچنے کے بعد ایک ترکیب سو جھی۔ میرے ماہوں زاد بھائی بمبئی میں ڈاکٹری پڑھ رہے تھے۔ میں نے بڑی منت کرتے ہوئے گزر گذا کر انہیں خط لکھا۔ ”مجھے اس عذاب سے آپ ہی نجات دلا سکتے ہیں۔ آپ کو کچھ نہیں کرنا ہے۔ صرف ماہوں جان کو خط لکھو دیجئے کہ میں آپ کو پسند ہوں، آپ مجھے سے شادی کریں گے، اس سے میری شادی رک جائے گی اور میں قرآن شریف کی، اللہ کی اور اپنی پڑھائی کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں کبھی آپ سے شادی نہیں کروں گی۔ خدا کے لئے یہ ثواب کا کام کیجئے اور میری شادی رکو ادیجئے۔“

بھائی میری چال میں پھنس گئے۔ چار پانچ دن بعد جب اماں سفیدی والوں

سے مول بھاؤ کر رہی تھیں، ماموں جان بڑھاتے ہوئے آئے اور بولے۔

”شوکت اسے پسند کرتا ہے، لڑکی تم باہر نہیں دے سکتیں۔ یہ خط دیکھو!“

اماں کی تو باچھیں کھل گئیں۔ ادھ سلے کپڑے اور پچھلے ہوئے سونے پر سے انٹھ کر درزی اور سنار چلے گئے۔ اپنی شادی رک گئی۔

جب میں چھوٹی تھی تو ہم پر دے والی کھنارا گاڑی میں اسکول جاتے تھے۔ وہ دروازے پر آ کر لگ جاتی تھی۔ اس میں ایک عورت تھی، وہ باہر جھانکنے پر ڈانتی تھی۔ میزک تک تو علی گڑھ میں رہے۔ اس کے بعد لکھنؤ ہائل میں چلے گئے۔

بچپن میں باہر اماں کے ساتھ شکر میں جانتے۔ ان دونوں پر دوں والی گاڑیاں ہوتی تھیں۔ اسکول میں ہی جب ڈرائیور ہو گئے، تب گھروالوں نے برقعہ پہنچنے کے لئے کہا تھا۔ ہاں یاد آیا۔ ایک بار ہم ریل گاڑی میں جا ب رہے تھے۔ منزل آنے سے پہلے بیویوں نے اپنے اپنے برفعے سنبھال لئے۔ میں نے سوچا، اترتے ہی مجھ کو بھی اپنا برفعہ پہننا پڑے گا۔ جب نوکر بستر باندھنے لگے تو میں نے اس میں اپنا برفعہ چھپا دیا۔ سات آٹھ بستروں میں سے ایک میں بندھ گیا۔ جب ٹرین رکی تو میں نے بہت بھولی ہن کر اپنا برفعہ ڈھونڈھنا شروع کر دیا۔ سب نے پوچھا کہ آخر گیا کہاں؟ اماں نے طلب کیا۔ کہیں چلتی ٹرین سے پھینک تو نہیں دیا کم بخت؟ جب پہنچ پر ایک دو دھوک پڑک تو میں نے جیسے بہت سوچ کر جواب دیا۔ ”ہو سکتا ہے، بستر میں بندھ گیا ہو، میں نے نکیے کے نیچے رکھ دیا تھا۔“

اب تو کوئی چارہ نہ تھا، بستر بند کرنے میں دو گھنٹے لگے تھے، کھولنے میں ایک تو گلتائی، لہذا میں بغیر برفعہ پنے ہی۔۔۔۔۔ باہر نکل آئی۔ ایک بار ابا نے پوچھا ”تم اسکول میں سڑھک کر رکھتی ہو؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں! ڈھکے ہوئے سر میں بڑی بیو قوف لگتی ہوں۔“ ابا ”ہوں“ کر کے رہ گئے۔

میرا پر دھچھوٹھ بھی چکا تھا۔ کبھی بہت ضرورت ہوتی تو کسی بوڑھی سے برفعہ مانگ کر پہن لیتی تھی۔ لیکن ملازمت سے بکدوش ہونے کے بعد جب ابا جودہ پور آئے تو بھی کو برفعہ چھوڑنا پڑا۔ ہوا یوں کہ جودہ پور میں ہندو۔۔۔۔۔ عورتیں

چادر اوڑھتی تھیں، چوپالوں میں بیٹھے مثلاً دیکھتے رہتے کہ اچھا یہ جا رہی ہیں۔ گھر سے نکل کر کہاں جاتی ہیں؟ یہ پوری خبر رکھتے تھے۔ رشته داری میں ہنگامہ ہوتا۔ ان باتوں سے بچنے کے لئے یہ ترکیب نکالی گئی کہ ہندو عورتوں کی طرح چادر اوڑھ کر نکلا جائے۔ نہ کوئی پہچانے گانہ بات کا بتکڑا بنے گا۔ تمام پہچان بر قعے کی ہوتی تھی۔ اسی وقت سے گھر میں بھی سب کا پردہ چھوٹ مگیا۔

کانج پہنچنے تک تو میں بر قعہ بالکل چھوڑ چکلی تھی۔ یونیورسٹی جانا ہوا تو کبھی ہائگے ہوئے بر قعے سے کام چلا لیتے تھے۔ پھر کھدر پہننا شروع کر دیا۔ کھدر کا قصہ یوں ہوا کہ گاندھی جی لکھنؤ آئے۔ ہم کچھ لڑکیاں ان سے ملنے گئیں۔ آنوراف مانگا تو بولے، تم سب کھدر پہن کر آؤ گی تو آنوراف دوں گا۔ شام کو ہم نے کھدر کی دھوپیاں خریدیں۔ دوسرے دن تمیں لڑکیاں بدیودار کھدری، کلف گھلی کھدر کی دھوپیاں پہنے گاندھی جی کے دربار میں حاضر ہو گئیں۔ گاندھی جی اپنی پوپلی سی ہنسی ہنس کر جیسے کہ رہے تھے۔ دیکھو تمیں لڑکیوں سے آج بدیکی کپڑا چھڑا دیا۔ اس وقت ہم سب کو انہوں نے بہت پیار سے بیٹھا کر آنوراف دیئے، کھدر کے چیلکے میں ہم ایک بار گرفتار بھی ہوتے ہوئے بچے۔

اس وقت میں طازمت کرنے لگی تھی۔ جو دھوپور اماں سے ملنے جا رہی تھی، دن تو تھڑہ کلاس میں کاٹا رات کو سونے کے لئے فرست کلاس میں بیٹھ کروالی۔ کھدر کی دھوپی اپنے ہوئے ہوئے تھی۔

جو دھوپور سے دو اسٹیشن پسلے بھلیرا سے ہی جو دھوپور میں خبر ہو گئی کہ کانگریس کی کوئی بڑی لیڈر آ رہی ہے۔ ان دونوں وہاں کانگریس پر پابندی عائد تھی، جو دھوپور میں جب کھدر کی براق سفید دھوپی اپنے چشمہ لگائے، بیک ہلانی ہوئی فرست کلاس کے ڈبے سے پلیٹ فارم پر اتری تو استقبال کے لئے پولیس کو کھڑا پایا۔ اتفاق سے سب انپکٹر میرے خالو تھے۔ وہ کانگریس لیڈر کی جگہ مجھے دیکھ کر چکرائے اور بولے ”اے یہ تو میری بھانجی ہے۔“ گھر تک تو عزت کے ساتھ لے آئے۔ لیکن گھر میں گھستے ہی شروع ہو گئے۔ ”بے شرم، بد تمیز، یہ کیا تماشا ہے؟“ میں نے نادان بنتے ہوئے کہا۔ ”کون سا تماشا؟“ میں نے تو خالی کھدر کی

سازھی پہنی ہے اور تو کچھ بھی نہیں کیا۔“ اب تو میں نوکری بھی کرتی تھی۔ زیادہ بحث میں کون پڑتا؟ ”

ان دنوں جودھ پور میں ایک ہیڈ مسٹریس کی جگہ خالی تھی۔ میں جودھ پور میں موجود پہلی بی۔ اے، لی لی پاس مسلمان لڑکی تھی ”حق مانگتا ہے مسلمان“ کا نعرو بلند ہوا اور یہ حق مجھے مل گیا۔ میں اسکول میں ہیڈ مسٹریس ہو گئی، اسکول جانے کی تو میں نے چادر اوڑھ لی۔ ماںوں بولے ”برقعہ اوڑھ کر جاؤ۔“ میں نے کہا ”نہ آت کر رہے ہیں اور چادر پھینک دندناتی ہوئی یہ کہہ کر باہر نکل گئی کہ بھر بر قہ پہننے کو کہا تو استغفارے دوں گی۔“ میری ضد سے بھی واقف تھے۔ کوئی کچھ نہ بولا۔

جب اپانے میڑک کے بعد آگے پڑھانے سے انکار کر دیا تھا، تب بھی میں نے انہیں یہ کہہ کر بلیک میل کیا تھا کہ اگر آپ نے مجھے نہیں پڑھانا تو میں مش میں جا کر بھیساں ہو جاؤں گی۔

ابا نے پوچھا تھا ”وہاں کیسے جاؤں گی؟“ میں نے جواب دیا تھا۔ ”ریل کی پسروں کے ساتھ ساتھ چلی جاؤں گی، راستہ مجھے معلوم ہے، وہ لوگ فوراً مجھے بھیساں کر کے لے جائیں گے اور اسکول میں داخلکر لیں گے۔“ ابا آگے پڑھانے کے لئے راضی ہو گئے تھے۔

میرے اپانے جب دیکھا کہ میں صرف پڑھنا چاہتی ہوں۔ شادی کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی، تو انہوں نے اگرہ میں ایک چھوٹا سا گھر میرے نام کر دیا۔ اس وقت تمنی چار ہزار کا ہو گا۔ میں نے اسے اپنے بھائی کی حفاظت میں دے دیا۔ سوچا گھر بیچ کر ولایت چلی جاؤں گی، پھر بہت اچھی نوکری مل جائے گی۔ اس لئے اگرہ بھائی کے گھر گئی۔ ان پر اپنا ارادہ ظاہر کیا اور کہا۔ ”ہمارا گھر بکوا دیجئے، میں ولایت جانا چاہتی ہوں۔“

بھائی کہنے لگے۔ ”کون سا گھر؟ وہ گھوڑی والا گھر! وہ تو تمہارے جعلی و سخنداز کے ہم کب کے بیچ کر کھا چکے، جو تھوڑے پیسے بیچے تھے، ان کا تمہاری بھائی کا زیور بنواریا۔“

بھائی بولیں ”اے ہائے، ہمیں بیچ میں مت گھینٹو، ہمیں کیا معلوم تم روپے

کہاں سے لائے۔“

بہت خفا ہوئی۔ میں نے کہا ”بھائی جان، آپ پر کیس چل سکتا ہے۔“

”ضرور چل سکتا ہے،“ میں جیل بھی ہو سکتی ہے، لیکن پیسے تمہیں اس وقت بھی نہیں طیں گے۔“

میں نے ان سے پوچھا: ”آپ دکیل ہیں، بتائیے! کیسے کیس کریں؟“

بولے۔ ”ہم تمہارا کیس لٹکتے ہیں، فیس نکالو۔“

یہ سن کر میری بھائی گمبرا گئیں۔ بھائی نے انہیں نظر انداز کرتے ہوئے مجھ سے بڑے پیار سے پوچھا۔ ”ولایت جانے کو بہت جی چاہ رہا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”جی تو چاہ رہا ہے۔“

بولے۔ ”تیرتی ہوئی چلی جاؤ۔“ اور پھر انہوں نے بمبئی سے آگے کا پورا راستہ سمجھانا شروع کر دیا۔ ”یہاں دو دن رکنا، پھر تیرتا، کچھ دنوں میں ولایت پنج جاؤں گی۔“ میری بھائی بڑی دلچسپی سے ہم دونوں کی مفتگروں سے رہی تھیں۔ بولیں۔ اس کے کپڑوں کا کیا ہو گا؟“

بھائی کرنے لگے۔ ”سوم جائے میں کر پینچھے پر باندھ لے گی اور کیا۔“

بھائی نے دوسرا سوال انھیا۔ ”سمندر میں تو بڑی بڑی مچھلیاں ہوں گی۔ اس کو کھانے جائیں گی۔“

بھائی بولے: ”ایک لمبا بانس ہاتھ میں رکھنا، اس سے مچھلیاں ہٹاتے رہنا۔“

دہیں ہمارے مختیحے بھی میٹھے ہوئے یہ سب باشیں سن رہے تھے۔ وہ تھوڑا ہکلاتے تھے۔ بولے ”فو۔ فو۔ فو، ہم بھی جائیں گے۔“

اور ان کے پنج میں کوئتے ہی ہمارا ولایت کا سفر ختم ہو گیا۔

میں نے بچپن میں قدم قدم پر زنجیریں توڑی ہیں۔ میری مخالف پارٹیاں بدوا داوڑلا پھاتیں لیکن جیت ہیٹھے میری ہی ہوتی۔

شاہد لطیف سے میں سب سے پہلے علی گڑھ میں ملی تھی۔ وہ اس وقت ایم۔ اے کر رہے تھے۔ میں بی۔ اٹی۔ اس کے بعد دل میں ایک بار سرسری ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد وہ بمبئی آگئے اور بمبئی ناکیز میں کمانی کار، مکالہ نگار کی حیثیت

سے ملازم ہو گئے۔ پونے دو سو شواہ پاتے تھے۔ جب میں اسکو انپکٹریں ہو کر بھائی آئی اور اپنے بڑے بھائی کے ساتھ رہنے لگی، اس وقت پھر شاہد سے ملاقات ہوئی۔ شاہد نے ہمارے گھر آنا جانا شروع کر دیا۔ میں بھی ان کے ساتھ تفریح کو نکل جاتی تھی۔ ہم لوگ ساتھ میں فلمیں دیکھتے۔ چوپانی پر نگے پاؤں گھومتے، دوسرے ادب دوستوں سے ملتے۔

ایک بار شاہد میری کمالی فروخت کرانے کے لئے بیٹے پاکیزے گئے۔ بھائی کو کسی نے بتا دیا۔ بھائی بہت خفا ہوئے وہ سوچتے تھے۔ میری بہن ساڑھے تین سو شخواہ پاتی ہے، کسی ڈیڑھ ہزار پانے والے کے ساتھ اس کی شادی کروں گا۔ پونے دو سو شخواہ پانے والے مکالمہ نگار سے ملنا جتنا میرا انسیں پسند نہ تھا۔ اس واقعہ کے بعد جب میرے آنے جانے پر پابندی کی جانے لگی تو میں نے بھائی کا گھر چھوڑ کر ہائل میں رہتا شروع کر دیا۔ میرے بھائی نے میرے انہی ماموں زاد کو پہاڑا جنہوں نے میری شادی روکوائی تھی کہ تم ابھی تک کنوارے ہو۔ عصمت سے پوچھو شاید تم سے شادی کرنے کے لئے ہاں کہہ دے۔ وہ ایک دن گھر آئے کہنے لگے۔ ”چوپانی چلو گی؟“ میں نے کہا ”ضرور چلوں گی۔“ ”تحوڑا تعجب بھی ہوا۔ چوپانی پر گھونٹے پھرنے کے بعد وہ کچھ تذبذب سے بولے۔ ”بھائی نے کہا ہے کہ اگر تمہاری مرضی ہے تو مجھ سے شادی کر لو۔“ میں نے کہا ”توبہ، توبہ! تم نے زندگی میں میرے ساتھ اتنی بھلائی کی ہے، تمہارے ساتھ یہ دشمنی کیوں مول لوں؟“ پھر میں نے سنجیدگی سے کہا ”تمہارے لئے جو بیوی میرے ذہن میں ہے وہ میں نہیں ہوں۔ ایک دم حسین بھولی بھائی لڑکی ہے وہ۔“ اور ہم واپس گھر آگئے۔ شاہد سے میری صرف دوستی تھی اس سے شادی تو گھپلے میں ہو گئی۔ خواجہ احمد عباس نے اپنے گھر کے قریب ایک قلیٹ لے دیا۔ محسن ایک قاضی پکڑ لائے اور شادی ہو گئی۔

میں نے شاہد کو شادی سے پسلے خوب سمجھایا کہ میں بڑی گزبر قسم کی عورت ہوں، بعد میں پچھتاو گے۔ میں نے ساری عمر زنجیریں کالی ہیں، اب کسی زنجیر میں جکڑی نہ رہ سکوں گی۔ فرمانبردار، پاکیزہ عورت ہوتا مجھ پر بجا ہی نہیں ہے لیکن شاہد نہ مانے، انہوں نے بھی دوستی میں ڈیک بانک بی تھی کہ عصمت سے شادی کروں

گا اور جب سب اس مذاق پر زور سے بس۔ یئے تو شاہد کا ارادہ اور بھی پختہ ہو گیا۔ شادی سے ایک دن پسلے میں نے آخری بار خبردار کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”اب بھی وقت ہے، مان جاؤ ہم ساری عمر دوست رہیں گے۔ ایک دوست کی طرح کہہ رہی ہوں“ جب وہ نہ مانے تب میں نے من ہی من میں سوچا کبھی بعد میں یاد کرو گئے کہ کسی دوست نے اچھا مشورہ دیا تھا۔ جو تم نے نہ مانا۔ شادی کے بعد بھی میں نے ایک بار کہا کہ بھی زبردستی تھوڑی ہے، نہ تجھے تو طلاق دے دینا۔ ”شاہد کا خیال تھا اگر وہ کبھی مجھے طلاق دے دیں گے، تو ووگ سمجھیں گے میں یہ انہیں چھوڑ کر بھاگ گئی ہوں۔

اس شادی میں میرے بڑے بھائی شریک نہ ہوئے۔ انہوں نے مرتبے دم تک ہماری شکل نہ دیکھی، باں، اماں کو معلوم ہوا تو انہوں نے چھوٹے بھائی کو بھی یہ دیکھنے کے لئے بھیج دیا کہ دیکھ کر آکر کم بنت کیا کر رہی ہے۔ چھ فٹ تین انج کے میرے چھوٹے بھائی جب شاہد سے دعا سلام کر چکے تو وہ مجھے ایک طرف لے جا کر بولے۔ ”یہ کیا کر رہی ہو! اتنا بھولا“ معصوم شکل کا لڑکا ہے اس سے شادی کو گی؟ دماغ چل گیا ہے کیا؟ میں نے بڑی مخصوصیت سے کہا مان ہی نہیں رہا ہے، میں نے تو کافی سمجھایا ہے، اب تم کو شش کر دیکھو۔“

شاہد نے بہت سکھ دیا۔ انہیں کتابیں خریدنے کی لٹ تھی۔ اچھی اچھی کتابیں خرید کر لاتے تھے۔ جو بھی نئی کتاب شائع ہوتی خرید لاتے۔ اب تک میرے پاس سب انہی کی خریدی ہوئی کتابیں ہیں، مرد عورت کو پونچ کر دیوی بنا نے کو تیار ہے وہ اسے محبت دے سکتا ہے، عزت دے سکتا ہے، صرف برابری کی وجہ نہیں دے سکتا آہا، کتنی خوبصورت بات، مرد سمجھتا ہے۔ ان پڑھ عورت سے کیسی دوستی؟ لیکن دوستی کے لئے پیار کی ضرورت ہوتی ہے، علم کی نہیں، شاہد نے مجھے برابری کا درجہ دیا تھا، اس لئے ہم دونوں نے ایک اچھی گھر بیو زندگی مگزارتی۔



لیف

جب میں جاڑوں میں لحاف اور حصی ہوں، تو پاس کی دیواروں پر اس کی پرچھائیں باقاعدی کی طرح جھومتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اور ایک دم سے میرا دماغ بیٹی ہوئی دنیا کے پردوں میں دوڑنے بھاگنے لگتا ہے۔ نہ جانے کیا کچھ یاد آنے لگتا ہے۔ معاف کیجئے گا، میں آپ کو خود اپنے لحاف کا رومان انگلیز ذکر بتانے نہیں جا رہی ہوں۔ نہ لحاف سے کسی قسم کا رومان جوڑا ہی جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں کبل آرام وہ سکی، مگر اس کی پرچھائیں اتنی بھیانک نہیں ہوتی جتنا۔———  
جب لحاف کی پرچھائیں دیوار پر ڈگنا کر رہی ہو۔ یہ تب کا ذکر ہے جب میں چھوٹی سی تھی، اور دن بھر بھائیوں اور ان کے دوستوں کے ساتھ مارکٹائی میں گزار دیا کرتی تھی۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا کہ میں کمپخت اتنی لڑاکا کیوں ہوں۔ اس عمر میں جب کہ میری اور بہنیں عاشق جمع کر رہی تھیں۔ میں اپنے پرائے ہر لڑکے اور لڑکی سے جو تم پیزار میں مغشول تھی۔

یہی وجہ تھی کہ اماں جب آگرہ جانے لگیں، تو ہفتہ بھر کے لئے مجھے اپنی منہ  
بولی بن کے پاس چھوڑ گئیں۔ ان کے یہاں اماں خوب جانتی تھیں کہ چوہے کا بچہ  
بھی نہیں، اور میں کسی سے بھی لا بھڑنہ سکوں گی۔ سزا تو خوب تھی! ہاں تو اماں مجھے  
بیکم جان کے پاس چھوڑ گئیں۔ وہی بیکم جان جن کا الحاف اب تک میرے ذہن میں  
عکرم لو ہے کے داغ کی طرح محفوظ ہے۔ یہ بیکم جان تھیں جن کے غریب ماں باپ  
نے نواب صاحب کو اسی لئے داماد بنا لیا کہ وہ پکی عمر کے تھے۔ مگر تھے نہایت نیک  
بھی کوئی رعنی بازاری عورت ان کے یہاں نظر نہ آئی۔ خود حاجی تھے اور بستوں کو  
چ کراچکے تھے۔ مگر انہیں نہایت عجیب و غریب شوق تھا۔ لوگوں کو کیوتراپالنے کا  
شوق ہوتا ہے، میرے لذاتے ہیں، مرغ بازی کرتے ہیں۔ اس قسم کے داہیات

کھیلوں سے نواب صاحب کو نفرت تھی۔ ان کے یہاں تو بس طالب علم رہتے تھے۔ نوجوان گورے گورے پتلی کمروں کے لڑکے جن کا خرچ وہ خود برداشت کرتے تھے۔ مگر بیکم جان سے شادی کر کے تو وہ انہیں کل ساز و سامان کے ساتھ ہی مگر میں رکھ کر بھول گئے۔ اور وہ بے چاری ولی پتلی ٹاکی ٹاک سی بیکم تنائی کے غم میں گھلنے لگی۔

نہ جانے ان کی زندگی کماں سے شروع ہوتی ہے۔ وہاں سے جب وہ پیدا ہونے کی غلطی کر چکی تھیں، یا وہاں سے جب وہ ایک نوابی بیکم بن کر آئیں، اور پھر کھٹ پر زندگی گزارنے لگیں۔ یا جب سے نواب صاحب کے یہاں لڑکوں کا زور بندھا، ان کے لئے مرغ نہ طوے اور لذیذ کھانے جانے لگے اور بیکم جان دیوان خانے کی درزوں میں سے ان لچکتی کمروں والے لڑکوں کی چست پنڈلیاں اور معطر باریک ٹھینم کے کرتے دیکھ دیکھ کر انگاروں پر لوٹنے لگیں۔

یا جب سے جب سے وہ متواتر مرادوں سے ہار گئیں، لے بندھے اور نوکے اور راتوں کو وظیفہ خوانی بھی چلتے ہو گئی۔ کمیں پھر میں جونک لگتی ہے نواب صاحب اپنی جگہ سے لش سے مس نہ ہوئے۔ پھر بیکم جان کا دل نوٹ گیا، اور وہ علم کی طرف متوجہ ہوئیں۔ لیکن یہاں بھی انہیں کچھ نہ ملا۔ عشقیہ ناول اور جذباتی اشعار پڑھ کر اور بھی پستی چھا گئی۔ رات کی نیند بھی ہاتھ سے گئی اور بیکم جان جی جان چھوڑ کر بالکل ہی یاس و خستت کی پوٹ بن گئی۔ چولے میں ایسا کپڑا تا۔ کپڑا پہنا جاتا ہے، کسی پر رعب گانٹھنے کے لئے۔ اب تھے تو نواب صاحب کو فرصت کہ شبکی کروں کو چھوڑ کر ذرا ادھر توجہ کریں، اور نہ وہ انہیں کمیں آنے جانے دیتے جب سے بیکم جان بیاہ کر آئی تھیں رشتہ دار آکر میتوں رہتے اور چلے جاتے۔ مگر بیچاری قید کی قید رہتیں۔

ان رشتہ داروں کو دیکھ کر اور بھی ان کا خون جتنا تھا کہ سب کے سب مزے سے مال اڑانے، عمدہ گھمی نگئے، جاؤں کا ساز و سامان بنانے آنے مرتے، اور باوجود نئی روئی کے لحاف کے پڑی سردی میں اکڑا کر تھیں۔ ہر کوٹ پر لحاف نئی نئی صور تھیں پا کر دیوار پر سایہ ڈالتا۔ مگر کوئی بھی سایہ ایسا نہ تھا جو انہیں زندہ رکھنے کے

لئے کافی ہو۔ مگر کیوں جنے پھر کوئی زندگی! بیکم جان کی زندگی جو تھی، جینا بد ا تھا نصیبوں میں، وہ پھر جینے لگیں، اور خوب جسیں!

رو نے انہیں نیچے گرتے گرتے سنبھال لیا۔ چٹ پٹ دیکھتے دیکھتے ان کا سوکھا جسم ہرا ہونا شروع ہوا۔ گال چمک اٹھے، اور حسن پھوٹ نکلا۔ ایک عجیب و غریب تیل کی ماش سے بیکم جان میں زندگی کی جھلک آئی۔ معاف کیجئے گا، اس تیل کا نسخہ آپ کو بستری سے بستری رسالہ میں بھی نہ ملے گا۔

جب میں نے بیکم جان کو دیکھا تو وہ چالیس بیالیس کی ہوں گی۔ افوہ کس شان سے وہ مند پر شیم دراز تھیں۔ اور رو ان کی پیٹھ سے لگی بیٹھی کر دباری تھی۔ ایک اودے رنگ کا دوشاہہ ان کے پیروں پر پڑا تھا۔ اور وہ صمارانی کی طرح شاندار معلوم ہو رہی تھیں۔ مجھے ان کی چھل بے انتہا پسند تھی۔ میرا جی چاہتا تھا۔ گھنٹوں بالکل پاس سے ان کی صورت دیکھا کروں۔ ان کی رنگت بالکل سفید تھی۔ نام کو سرخی کا ذکر نہیں۔ اور بال سیاہ اور تیل میں ڈوبے رہتے تھے۔ میں نے آج تک ان کی مانگ ہی گھٹی نہ دیکھی۔ کیا مجال جو ایک بال اوہرا دھر ہو جائے۔ ان کی آنکھیں کالی تھیں اور ابرو پر کے زائد بال علیحدہ کر دینے سے کمانیں سی ٹھنچی رہتی تھیں۔ آنکھیں ذرا تنی ہوئی رہتی تھیں۔ بھاری بھاری پھولے ہوئے پوٹے مولنی مولنی پلکیں۔ سب سے جو ان کے چہرے پر حرمت انگیز جاذب نظر چیز تھی، وہ ان کے ہونٹ تھے۔ ”عموا“ وہ سرخی سے رنگے رہتے تھے۔ اوپر کے ہونٹ پر ہلکی ہلکی موچھیں سی تھیں، اور کپٹیوں پر لمبے لمبے بال کبھی کبھی ان کا چہرہ دیکھتے دیکھتے عجیب سائکنے لگتا تھا۔ کم عمر لڑکوں جیسا!

ان کے جسم کی جلد بھی سفید اور چکنی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کسی نے کس کر ٹائکے لگا دیئے ہوں۔ ”عموا“ وہ اپنی پنڈلیاں کھجانے کے لئے کھوتیں، تو میں چکے چکے ان کی چمک دیکھا کرتی۔ ان کا قد بہت لمبا تھا۔ اور پھر گوشت ہونے کی وجہ سے وہ بہت ہی لمبی چوڑی معلوم ہوتی تھیں لیکن بہت متناسب اور ڈھلا ہوا جسم تھا۔ بڑے بڑے چکنے اور سفید ہاتھ اور سڈول کر، تو رو ان کی پیٹھ کھجا یا کرتی تھی۔ یعنی گھنٹوں ان کی پیٹھ کھجا تی پیٹھ کھجاانا بھی زندگی کی ضروریات میں سے تھا۔ بلکہ شاید

ضرورت سے بھی زیادہ۔

رو کو گھر کا اور کوئی کام نہ تھا بس وہ سارے وقت ان کے چھپر کھٹ پر چڑھی کبھی چیر، کبھی سرا اور کبھی جسم کے دوسرے حصے کو دیا کرتی تھی۔ کبھی تو میرا دل ہول انھتا تھا، جب دیکھو رو کچھ نہ کچھ دبارہی ہے، یا ماش کر رہی ہے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔ میں اپنا کستی ہوں، کوئی اتنا چھوئے بھی تو میرا جسم تو سڑکل کے ختم ہو جائے۔

اور پھر ہی روز روز کی ماش کافی نہیں تھی۔ جس روز بیکم جان نہاتیں۔ یا اللہ بس دو گھنٹے پہلے سے تیل اور خوبصوردار ابٹنوں کی ماش شروع ہو جاتی۔ اور اتنی ہوتی کہ میرا تو تخیل سے ہی دل ثوٹ جاتا۔ کمرہ کے دروازے بند کر کے اس سیخیاں سلگتیں اور چلتا ماش کا دور۔ اور عموماً صرف رو ہی رہتی۔ باقی کی نوکریاں بربرا آتی دروازہ پر سے یہ ضرورت کی چیزیں دیتی جاتیں۔

بات یہ تھی کہ بیکم جان کو کھبلی کا مرض تھا۔ بے چاری کو ایسی کھبلی رہتی تھی اور ہزاروں تیل اور ابٹنے ملے جاتے تھے۔ مگر کھبلی تھی کہ قائم۔ ڈاکٹر حکیم کہتے کچھ بھی نہیں۔ جسم صاف چٹ پڑا ہے۔ ہاں کوئی جلد کے اندر بیماری ہو تو خیر۔ نہیں بھی یہ ڈاکٹر تو موئے ہیں پاگل۔ کوئی آپ کے دشمنوں کو مرض ہے اللہ رکھے خون میں گرمی ہے۔ رو مسکرا کر کھتی، اور میمین میمین نظروں سے بیکم جان کو گھوراتی۔ اود یہ رو۔۔۔ جتنی یہ بیکم جان گوری، اتنی ہی یہ کالی۔ جتنی یہ بیکم جان سفید تھیں اتنی ہی یہ سرخ۔ بس جیسے تپایا ہوا لوہا۔ بلکہ بلکے چیپ کے داغ۔ گٹھا ہوا نھوں جسم۔ پھر تیلے چھوٹے چھوٹے ہاتھ کسی ہوئی چھوٹی سی توں۔ بڑے بڑے پھولے ہوئے ہونٹ، جو ہمیشہ نبی میں ڈوبے رہتے اور جسم میں عجیب گھبرا نے والی بو کے شرارے نکلتے رہتے تھے، اور یہ نکلنے تھے پھولے ہوئے ہاتھ کس قدر پھرتیلے تھے، ابھی کمر پر، تو وہ لبجے پھسل کر گئے کو لمبوں پر دہاں رپٹے رانوں پر اور پھر دوڑ ٹھنڈی کی طرف۔ میں تو جب کبھی بیکم جان کے پاس بیٹھتی یہی دیکھتی کہ اب اس کے ہاتھ کماں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔

گرمی جاڑے بیکم جان حیدر آبادی جالی کارگے کے کرتے پہنچتیں۔ مگر۔

رنگ کے پاجامے اور سفید جھاگ سے کرتے اور پنکھا بھی چلتا ہو۔ پھر بھی وہ بلکی دلائی ضرور جسم پر ڈھکے رہتی تھیں۔ انہیں جاڑا بہت پسند تھا۔ جاڑے میں مجھے ان کے یہاں اچھا معلوم ہوتا۔ وہ ہبھی جلتی بہت کم تھیں۔ قالین پر لیٹھی ہیں۔ پینچھے کچھ رہی ہے۔ خشک میوے چبارہی ہیں اور بس۔ رو سے دوسری ساری توکرائیاں خار کھاتی تھیں۔ چڑیل بیکم جان کے ساتھ کھاتی، ساتھ اٹھتی بیٹھتی اور ماشاء اللہ ساتھ ہی سوتی تھی۔ رو اور بیکم جان عام جلوؤں اور مجموعوں کی دلچسپ گفتگو کا موضوع تھیں۔ جماں ان دونوں کا ذکر آیا، اور قہقہے اٹھئے۔ یہ لوگ نہ جانے کیا کیا چلکتے غریب پر اڑاتے۔ مگر وہ دنیا میں کسی سے لمتی نہ تھیں۔ وہاں تو بس د تھیں اور ان کی کھجولی۔ میں نے کہا اس وقت میں کافی چھوٹی تھی، اور بیکم جان پر فدا۔ وہ مجھے بہت ہی پیار کرتی تھیں۔ اتفاق سے اماں اگرے گئیں۔ انہیں معلوم تھا کہ اکیلے گھر میں بھائیوں سے مار کٹائی ہو گی۔ ماری ماری پھروں گی۔ اس لئے وہ ہفتہ بھر کے لئے، بیکم جان کے پاس چھوڑ گئیں۔ میں بھی خوش اور بیکم جان بھی خوش۔ آخر کو اماں کی بھائی بی بی ہوئی تھیں۔

سوال یہ انھا کہ میں سوؤں کہاں؟ تدرتی طور پر بیکم جان کے کرے میں۔ لہذا میرے لئے بھی ان کے چھپر کھٹ سے لگا کر چھوٹی سی پلنگزی ڈال دی گئی۔ جس گیارہ بجے تک تو باش کرتے رہے۔ میں اور بیکم جان تاش کھیلتے رہے، اور پھر میں سونے کے لئے اپنے پلنگ پر چلی گئی، اور جب میں سوئی تو روکی، ہی بیٹھی ان کی پینچھے کھجوارہی تھی۔ ”بھنگن ٹھیں کی۔“ میں نے سوچا۔ رات کو میری ایک دم آنکھ کھلی، تو مجھے عجیب طرح اک ڈر لگنے لگا۔ کرہ میں گھپ اندر ہرا۔ اور اس اندر ہرے میں بیکم جان کا لحاف ایسے مل رہا تھا، جیسے اس میں ہاتھی بند ہو۔ بیکم جان۔۔۔۔۔ میں نے ڈری ہوئی آواز نکانی، ہاتھی کا ہلنا بند ہو گیا۔ لحاف نیچے دب گیا۔

”کیا ہے۔ سور ہو۔۔۔۔۔“ بیکم جان نے کہیں سے آواز دی۔  
 ”ڈر لگ رہا ہے۔“ میں نے چوہے کی سی آواز سے کہا۔  
 ”سو حاو۔۔۔۔۔ ڈر کی کیا بات ہے۔ آیت الکرسی پڑھ لو۔“

”اچھا-----“ میں نے جلدی جلدی آیت الکری پڑھی، مگر لعیم مائین پر ہر دفعہ آکر ایک گئی۔ حالانکے مجھے اس وقت پوری یاد تھی۔

”تمارے پاس آجائیں بیکم جان۔“

”نہیں----- سورہو----- بیٹی-----“ ذرا سختی سے کہا۔

اور پھر دو آدمیوں کے کھر پھر کرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ ہے رے دوسرا کون میں اور بھی ڈری۔

”بیکم جان----- چور تو نہیں۔“

”سو جاؤ بیٹا----- کیسا چور۔“ رو کی آواز آئی۔ میں جلدی سے منہ لحاف میں ڈال کر سو گئی۔

صحیح میرے ذہن میں رات کے خوفناک نظارے کا خیال بھی نہ رہا۔ میں ہمیشہ کی دہمی ہوں۔ رات کو ڈرنا، انھوں نے بھاگنا اور بزبرداانا تو بچپن میں روز ہی ہوتا تھا۔ سب تو کہتے تھے کہ مجھ پر بھوتوں کا سایہ ہو گیا ہے۔ لہذا مجھے خیال بھی نہ رہا۔ صحیح کو لحاف بالکل معصوم نظر آ رہا تھا مگر دسری رات میری آنکھ کھلی تو رو رو اور بیکم جان میں کچھ جھکڑا بڑی خاموشی سے چھپر کھٹ پر ہی طے ہو رہا تھا۔ اور میری خاک سمجھو میں نہ آیا تھا۔ اور کیا فیصلہ ہوا۔ رو چکیاں لے کر روئی پھر ملی کی طرح چڑچڑ رکاب چانے جیسی آوازیں آنے لگیں۔ اونہ میں تو گھبرا کر سو گئی۔

آن رو اپنے بیٹے سے ملنے گئی ہوئی تھی۔ وہ بڑا بھسر ہو تھا۔ بہت کچھ بیکم جان نے کیا، اسے دوکان کرائی۔ گاؤں میں لگایا۔ مگروہ کسی طرح مانتا ہی نہ تھا۔ نواب صاحب کے یہاں کچھ دن رہا۔ خوب جوڑے بھاگے بھی بنے، نہ جانے کیوں ایسا بھاگا کہ رو سے ملنے بھی نہ آتا تھا۔

لہذا رو ہی اپنے کسی رشتہ دار کے یہاں اس سے ملنے گئی تھی۔ بیکم جان نہ جانے دیتی مگر رو بھی بجور ہو گئی۔

سارا دن بیکم جان پریشان رہیں۔ ان کا جوڑ جوڑ نوٹا رہا۔ کسی کا چھوٹا بھی انسیں نہ بھاتا تھا۔ انہوں نے کھاتا بھی نہ کھایا۔ اور سارا دن اداس پڑی رہیں۔

”میں کھجاؤں سچ کہتی ہوں“ میں نے بڑے شوق سے تاش کے پتے باٹھے ہوئے کہا۔ بیکم جان مجھے غور سے دیکھنے لگیں۔

میں تھوڑی دری کھجاتی رہی، اور بیکم جان چکلی لیٹھی رہیں۔ دوسرے دن رلو کو آتا تھا۔ مگر وہ آج بھی غائب تھی۔ بیکم جان کا مزاج چڑا چڑا ہوا تھا۔ چائے پی پی کر انہوں نے سر میں درد کر لیا۔

میں پھر کھجانے لگی، ان کی پیٹھ۔۔۔ چکنی میز کی تنخی جیسی پیٹھ۔۔۔ میں ہولہ ہولے کھجاتی رہی۔ ان کا کام کر کے کیسی خوشی ہوتی تھی۔ ”زرا زور سے کھجاو۔۔۔ بند کھول دو۔۔۔“ بیکم جان بولیں۔ ادھر۔۔۔ اے ہے ذرا شانے سے نیچے۔۔۔ ہا۔۔۔ واہ بھی واہ۔۔۔ ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ ”وہ سرور میں شھنڈی سانسیں لے کر اطمینان کا اظہار کرنے لگیں۔

”اور ادھر۔۔۔“ حالانکہ بیکم جان کا ہاتھ خود جا سکتا تھا مگر وہ مجھ سے ہی کھجو رہی تھیں اور مجھے الٹا فخر ہو رہا تھا۔“ یہاں۔۔۔ اوئی۔۔۔ تم گردگدی کرتی ہو۔۔۔ واہ۔۔۔ ”وہ نہیں۔ میں باتیں بھی کر رہی تھی اور کھجا بھی رہی تھی۔

تمہیں کل بازار بھیجنے گی۔۔۔ کیا لوگ۔۔۔ وہی سوتی جگاتی گزیا۔ ”نہیں بیکم جان۔۔۔ میں تو گزیا نہیں لیتی۔۔۔ کیا بچہ ہوں اب میں۔۔۔“

بچہ نہیں تو بوزھی ہو گئی۔۔۔ وہ نہیں۔۔۔ گزیا نہیں تو بپوا لیتا۔۔۔ کپڑے پہننا خود۔ میں دوں گی تھیں بہت سے کپڑے سن۔۔۔ ”انہوں نے کروٹ لی۔

”اچھا“ میں نے جواب دیا۔

”ادھر۔۔۔“ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر جہاں کھجلی ہو رہی تھی رکھ دیا۔ جہاں انہیں کھجلی معلوم ہوتی، وہاں رکھ دیتی۔ اور میں بے خیالی میں بوے کے دھیان میں ڈوبی مشین کی طرح کھجاتی رہی۔ اور وہ متواتر باتیں کرتی رہیں۔

”سن تو----- تمہاری فرائیں کم ہو گئی ہیں۔ کل درزی کو دے دوں گی کہ نئی سی لائے۔ تمہاری اماں کپڑے دے گئی ہیں۔“

”وہ لال کپڑے کی نہیں بناؤں گی----- چماروں جیسی ہے۔“ میں بکواس کر رہی تھی، اور میرا ہاتھ نہ جانے کماں سے کماں پہنچا۔ باتوں باتوں میں مجھے معلوم بھی نہ ہوا۔ بیکم جان تو چت لیشی تھیں----- ارے----- میں نے بعلدگی سے ہاتھ کھینچ لیا۔

”اویٰ لڑکی----- دیکھ کر نہیں کھجاتی----- میری پسلیاں نوچے ڈالتی ہے۔“ بیکم جان شرارت سے مسکرائیں اور میں جھینپ گئی۔

”ادھر آ کر میرے پاس لیٹ جا-----“ انہوں نے مجھے بازو سے سر رکھ کر لانا دیا۔

اے ہے کتنی سوکھ رہی ہے۔ پسلیاں نکل رہی ہیں۔“ انہوں نے پسلیاں گتنا شروع کیں۔

”اوی-----“ میں مننا کی۔

”اوی----- تو کیا میں کھا جاؤں گی----- کیسا ٹنگ سویٹر بنا ہے!“ مگر مبیناں بھی نہیں پہناتم نے-----“ میں کھلانے لگی۔

”کتنی پسلیاں ہوتی ہیں-----“ انہوں نے بات بدلتی۔

”ایک طرف نو اور ایک طرف دس۔“ میں نے اسکوں میں یاد کی ہوئی ہائی جیمن کی مدلی۔ وہ بھی اوٹ پنگ۔

”ہٹا لو ہاتھ----- ہاں ایک----- دو----- تین-----“

میرا دل چاہا کسی طرح بھاگوں----- اور انہوں نے زور سے بھینچا۔ ”اوی-----“ میں محل گئی----- بیکم جان زور زور سے ہٹنے لگیں۔ اب بھی جب کبھی میں ان کا اس وقت کا چہرہ یاد کرتی ہوں تو دل گمراہنے لگتا ہے۔ ان کی آنکھوں کے چپٹوے اور وزنی ہو گئے۔ اوپر کے ہونٹ پر سیاہی بھری ہوئی تھی۔ باوجود سردی کے پسندے کی نسبتی بوندیں ہونٹوں پر اور ٹاک پر چمک

رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ ٹھنڈے بخ تھے۔ مگر زم جیسے ان پر کھال اتر گئی ہو۔ انہوں نے شال اتار دی تھی، اور کارگے میں کرتے میں ان کا جسم آئے کی لون کی طرح چک رہا تھا۔ بھاری جڑا سونے کے بٹن گرباں کے ایک طرف جھول رہے تھے۔ شام ہو گئی تھی اور کمرے میں اندھیرا گھٹ رہا تھا۔ مجھے ایک نامعلوم ذرے دھشت سی ہونے لگی۔ بیکم جان کی گمراہی آنکھیں۔ میں رونے لگی دل میں۔ وہ مجھے ایک مشی کے کھلونے کی طرح بھینچ رہی تھیں۔ ان کے گرم گرم جسم سے میرا دل بولا نے لگا۔ مگر ان پر تو جیسے کوئی بھتنا سوار تھا۔ او میرے دماغ کا یہ حال کہ نہ چیخا جائے، اور نہ رو سکوں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پست ہو کر نہ ہال لیت گئیں۔ ان کا چہرہ پھیکا اور بدر و نق ہو گیا۔ اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگیں۔ میں سمجھی کہ اب مرس یا اور وہاں سے اٹھ کر سرپٹ بھائی باہر۔

شگر ہے کہ رلو رات کو آجئی، اور میں ذری ہوئی جلدی سے لحاف اوڑھ کر سو گئی مگر نہ کھاں چپ گھنٹوں پڑی رہی۔

اماں کسی طرح آہی نہیں چکی تھیں۔ بیکم جان سے مجھے ایسا ڈر لگتا تھا کہ میں مارا دن ماماوں کے پاس بیٹھی رہی مگر ان کے کمرے میں قدم رکھتے دم نکلا تھا اور کہتی کس سے اور کہتی ہی کیا کہ بیکم جان سے ڈر لگتا ہے۔ بیکم جان جو میرے اوپر جان چھڑ کتی تھیں۔

آج رلو میں اور بیکم جان میں پھر ان بن ہو گئی۔۔۔ میری قسمت کی خرابی کئے یا کچھ اور مجھے ان دونوں کی آن بن سے ڈر لگا۔ کیوں کہ فوراً ہی بیکم جان کو خیال آیا کہ میں باہر سردی میں گھوم رہی ہوں۔ اور مروں گی نمونیہ میں۔

”لڑکی کیا میرا سرمنڈاۓ گی۔ جو کچھ ہو ہوا گیا تو اور آفت آئے گی۔“۔ انہوں نے مجھے پاس بٹھا لیا۔ وہ خود منہ ہاتھ سلفنی میں دھو رہی تھیں، چائے پائی پر رکھی تھی۔ ”چائے تو بناؤ۔۔۔ ایک پیالی مجھے بھی رہنا۔۔۔ وہ تو یہ سے منہ خشک کر کے بولیں ذرا کپڑے بدل لوں۔“۔

وہ کپڑے بدلتی رہیں اور میں چائے پیتی رہی۔ بیکم جان نائن سے پیٹھے ملواتے وقت اگر مجھے کسی کام سے بلواتیں تو میں گردن موڑے جاتی۔ اور واپس بھاگ

آتی۔ اب جوانوں نے کپڑے بدلتے تو میرا دل الٹنے لگا۔ منہ موزے میں چائی چلتی رہی۔ ”ہائے اماں۔۔۔ میرے دل نے بے کسی سے پکارا۔۔۔ آخر ایسا میں بھائیوں سے کیا لڑتی ہوں جو تم میری مصیبت۔۔۔ اماں کو ہمیشہ سے میرا لڑکوں کے ساتھ کھلینا ناپسند ہے۔ کوئی بھلا لڑکے کیا شیر پختے ہیں جو نگل جائیں گے ان کی لاڈلی کو۔۔۔ اور لڑکے بھی کون، خود بھائی اور دو چار سڑے سڑائے ذرا ذرا سے ان کے دوست ہم نہیں وہ تو عورت ذات کو سات تالوں میں رکھنے کی قائل اور یہاں بیکم جان کی وہ دہشت کہ دنیا بھر کے غنڈوں سے نہیں بس چلتا، سواں وقت سڑک پر بھاگ جاتی، پھر وہاں نہ لکھتی۔ مگر لا چار تھی، مجبور لکھجہ پر پھر رکھے بیٹھی رہی۔ کپڑے بدلتے سولہ سنگھار ہوئے اور گرم گرم خوشبوؤں کے عطر نے اور بھی انہیں انگارا بنا دیا اور وہ چلیں مجھ پر لاڈا تارنے۔

”مگر جاؤں گی۔۔۔“ میں نے ان کی ہر رائے کے جواب میں کہا اور رو نے لکھی۔ ”میرے پاس تو آؤ۔۔۔ میں تمہیں بازار لے چلوں گی سنو تو۔“

مگر میں کلی کی طرح پھسل گئی۔ سارے کھلونے مٹھائیاں ایک طرف اور مگر جانے کی رٹ ایک طرف۔

”وہاں بھیا ماریں گے۔۔۔ چڑیل۔۔۔“ انہوں نے پیار سے مجھے تھپڑ لگایا۔ ”پڑیں ماریں بھیا۔۔۔“ میں نے سوچا اور روٹھی اکڑی بیٹھی رہی۔ ”کچھی امیاں کھٹی ہوتی ہیں بیکم جان۔۔۔“ جلی کٹی رو نے رائے دی اور پھر اس کے بعد بیکم جان کو دورہ پڑ گیا۔ سونے کا ہار جو وہ تھوڑی دیر پہلے مجھے پسنارہی تھیں۔

ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ سہیں جائی کا دوپٹہ تار تار۔ اور وہ مانگ جو میں نے کبھی مگری نہ دیکھی تھی جھاڑ جھنکار ہو گئی۔

اوہ۔۔۔ اوہ اوہ اوہ۔۔۔ وہ جھنکلی لے لے کر چلانے لگیں۔ میں رپٹی باہر۔ بڑے جتنوں سے بیکم جان کو ہوش آیا۔ جب میں سونے کے لئے کرے میں دبے پیرجا کر جھائی تور لو ان کی کرے سے گھنی جسم دبارہی تھی۔

”جو تی اتار دو۔۔۔ اس نے اس کی پسیاں کھجاتے ہوئے کہا اور میں

چوہیا کی طرح لحاف میں دبک گئی۔  
سر پر پھٹ کج۔۔۔ بیکم جان کا لحاف اندر میرے میں پھر ہاتھی کی طرح  
جھوم رہا تھا۔

”اللہ! آں۔۔۔“ میں نے مری ہوئی آواز نکالی۔ لحاف میں ہاتھی چھلکا اور  
بینہ گیا۔ میں بھی چپ ہو گئی۔ ہاتھی نے پھر لوٹ چکائی۔ میرا روائی رواں کانپا۔ آج  
میں نے دل میں نہان لیا کہ ضرور ہمت کر کے سربانے کا لگا ہوا بلب جلا دوں۔ ہاتھ  
پھر پھر رہا تھا اور جیسے اکڑوں بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چڑ چڑ پچھے کھانے کی  
آوازیں آرہی تھیں۔ جیسے کوئی مزیدار چلنی چلہ رہا ہو۔ اب میں سمجھی۔ یہ بیکم جان  
نے آج کچھ نہیں کھایا۔ اور رو مردی تو ہے سدا کی چٹو۔ ضرور یہ ترمال اڑا رہی  
ہے۔ میں نے نتھنے پھلا کر سوں سوں ہوا کو سونگھا۔ سوائے عطر، صندل اور حنا کی  
عکرم گرم خوبیوں کے اور کچھ محسوس نہ ہوا۔

لحاف پھر امنڈا شروع ہوا۔ میں نے بہتر اچاہا کہ چپکی پڑی رہوں۔ گراس  
لحاف نے تو ایسی عجیب عجیب شکلیں بناں شروع کیں کہ میں ڈر گئی۔ معلوم ہوتا تھا  
غون غون کر کے کوئی بڑا مینڈک پھول رہا ہے اور اب اچھل کر میرے اوپر آیا۔  
آ۔۔۔ ن۔۔۔ اماں۔۔۔ میں ہمت کر کے گنگتاں۔ گردہاں کچھ  
شنوائی نہ ہوئی اور میرے لحاف اور دماغ میں گھس کر پھولنا شروع ہوا۔ میں نے  
ڈرتے ڈرتے پنگ کے دوسری طرف پیر اتارے اور ٹول کر بھلی کا بٹن دیا۔ ہاتھ  
نے لحاف کے نیچے ایک قلابازی لگائی اور پچک گیا۔ قلابازی لگانے میں لحاف کا کونہ  
فٹ بھرا گھا۔

اللہ! میں غراب سے اپنے بچھونے میں آئی۔



## پیشہ

مجھے معلوم تھا وہ سو بیان سو طوائف ہیں۔ وہ سرخ مصنوعی بال چست کپڑے اور دن رات مردوں کے نھٹ، ناج گانے موٹے میں قبیلے مجھے اپنے کرے میں بیٹھے بٹھائے جھکو لا کرتے تھے۔ ہم عورتیں بڑے سے بڑے پہلوان کو چلت کر سکتی ہیں۔ پر جب طوائف سے لگر ہوتی ہے تو ساری نسوانیت اپنا سامنہ لے کر رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماں لوری کے ساتھ ساتھ بچے کے دل میں یہ بات چپکا دیتی ہے کہ طوائف اڑدا ہے۔ سانپ ہے؟ کیا کچھ ہے۔

اور یہی بچپن کی نفرت اب تک خون کے ذردوں میں ناج رہی ہے ویسے ہزاروں عورتیں گزر جائیں پڑتے نہیں چلتا مگر طوائف کو سونگھ کر ہرن کی طرح بھڑک جاتی ہوں مجھے یاد ہے کہ یہ خوبیوں پہلی دفعہ میں نے بہت بچپن میں سونجھی تھی بھڑائیجی میں سید میاں کے مزار پر جمعرات کو طوائفوں کا جنمگاہ ہوتا ہے۔ اللہ کے پیارے بھی اس متبرک دن کو کچھ زیادہ ہی آ جاتے۔ ایک دن ایک بچی سی طوائف نے مجھے نہ جانے کس جذبہ تحت کود میں انھالیا وہ اس کے پھسلنے کپڑے اور خوبیوں میں باہوا سینہ میں جلد ہی اس کی گود سے محمل آئی اس دن سب نے مجھے تھوڑو تھوڑ کے چھیڑا کہ بچاری کو رندی نے چھولیا۔ اور میں بھی اس ہٹک کے احساس سے دیر تک روئی رہی۔ پھر ایک دن میری پھوپھی آئیں اور انہوں نے مجھے پار کیا۔ تو وہی پھسلتے ہوئے کپڑے اور مہلکا ہوا سینہ۔ نہ جانے کیوں میں فوراً محمل کر بھاگ آئی۔ میرا اندازہ نھیک نکلا اور میری رنگیں پھوپھی مشکل سے میں بھر رہی ہوں گی کہ دس بچوں کے باپ میرے ابا جان ان پر بری طرح سے عاشق ہو گئے۔ میری ماں بیچاری بچھ کر رہ گئیں۔ بھلا پان بیڑی کی دکان کے سامنے کوئی شاندار ہو ٹھیکھوں دے۔ بیچاری دکان کا جوبن کے دن کا؟ خیر نونے نوکلے ہوئے تب کمیں جا کر

ان کے گردوں میں درد انہا اور وہ بھاگ گئیں۔

ہاں تو میرا مطلب ہے کہ ہم عورتیں طوائف کو سونگھ کر ہی لکھ جاتی ہیں۔ بقول کے۔ ان کا نہ ساد کیجھ کر حفاظتی دیواریں کھڑی کرنے کو جی چاہتا ہے وہ کوئی نہ سے اتر رہی تھیں اور میں چڑھ رہی تھی میں نے انہیں سونگھ لیا۔

ایے ہے یہ میں کہاں آگئی ہوں۔ کیا کہے گی دنیا؟ میرے محلہ والے کیا کہیں گے؟ ایک سے ایک بد مزاج بھرا پڑا ہے محلہ والوں میں زیادہ یہ محلے والے ایسی ولسی باتوں کے پچھے پڑے رہتے ہیں۔

عید کا دن تھا۔ غریبی میں کیسی عید اور کیا محروم کپڑے بھی نہ بدلتے لیٹھی اخبار دیکھتی رہی۔ پڑوسن کے نیچے یہاں چار بجے سے برتن کھڑکا رہے تھے۔ ان بیچاریوں کو نیازِ نذر کی بڑی فکر رہتی تھی۔ بستر پر لیٹھی ناشتا کر رہی تھی کہ دروازہ کھنکھنایا اور قبل اس کے کہ میں سنبھلوں وہ آن دھمکیں۔

عام طور پر کے معلوم ہے کیا ہونے والا ہے۔ اور میری عمر میں یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی طوائف دندناتی چلی آئی ہو لذائیں گھبرا گئی۔

ایے ہے میں نے کما کمیں تم ناشتا نہ کر چکو۔ کیا لشتم پشم سویاں بھاری ہیں۔ وہ اپنے چست کپڑوں میں سے پھنکاریں۔ کمخت کو یہ بھی سوچنے کی فرصت نہیں تھی کہ تلک کپڑے پہننے کے دن کبھی کے جا پچے اور خیر سے آئے کو تسوں سے کنے سے نہایت ناہموار سطح ہو جاتی ہے۔

میں صبح کے وقت مٹھاں نہیں کھاتی۔ میں نے غور سے گرہتن بننے کی کوشش کی۔

”اوی آج عید کے دن بھی مٹھاں نہیں۔ بھی تم تھیں ہماری قسم تھوڑی سی ضرور چکھو۔“ وہ نہایت بے ملکفانہ انداز میں پلٹک پر بیٹھ گئیں۔

یا اللہ کیا یہ مجھے بھی طوائف سمجھ کر تبرک کے ذریعہ میرے گناہ دھونے آئی تھی۔ اب یہ کیسے بتاؤں کہ میں قطعی نیک اور پارسا ہوں اور پھر قسم اودھ معبودی پر تو وہی اس کے ہزاروں عاشقوں کی چھوڑی ہوئی قسم تھی جو یہ میرے حلق میں نہ تو

رہی ہیں۔ میں جل اٹھی۔ لیکن جب وہ بے حیائی سے صرہی ہو گئیں تو میں نے دو چمچے چکھے لئے۔

بادر جی نے کہا کہ یہ یوئی مسلمان ہیں۔ بس میرا جی ملنے کو پھر ک رہا تھا۔۔۔ مگر تم تو سارا دن غائب رہتی ہو۔ کسی نے انہیں پکارا اور وہ چلی گئیں۔ میں نے دو چمچے اور کھائے! یا خدا جی چاہا طق میں انگلی ڈال کرتے کر دوں یہ مجھے کیا ہو گیا تھا میں طوال ف کی کمالی کھا رہی تھی۔ عصمت فردشی کی جمع کی ہوئی گھناولی دولت فاہشہ بد کار کا پیرس!

مگر پھر میرے دل میں نہایت بے شرمی کے باغیانہ خیالات ناچنے لگے۔ یہ رندی کا پیرس بھی تو اپنے باپ دادا ہی کا پیرس ہے۔ میرے ایک چھا تھے جسنوں نے تین ہفتوں میں تین ہزار روپیہ رعنی بازی میں اڑا دیا تھا۔ اس سے مجھے کیا کہ میری چمی رعنی کون تھی۔ ان لال بالوں ہی کی کوئی بہن بھانجی ہو گی۔ میں نے اور شوق سے سویاں کھانی شروع کیں جیسے پھینکا ہوا مال سمیٹ رہی تھی۔ مجھے ایک قسم کا اطمینان سا ہو رہا تھا۔ میں ایک امیر کو تھوڑا سا غریب بنا رہی تھی ایک چمچے اور لیا اور میرا منہ کیوڑہ اور میوہ میں سکھلی ہوئی سویوں سے بھر گیا۔ ایک بڑا سا سالم پست میری داڑھ کے نیچے کچ سے آئیا، چکنائی کی بخی بخی بوندیں منہ میں پھد کئے لگیں جیسے میں نے کسی موٹے سے دنبے کو چبا ڈالا۔ مگر فوراً مجھے اس کی چربی کے خیال سے ابکائی آئی۔ مجھے وہی اطمینان محسوس ہو رہا تھا جو انگریزی کپڑے جلاتے وقت بلوائیں کو ہوتا ہے۔ ہماری انتقام پسند آنکھیں ان خالی خولی کپڑوں میں اپنی مرضی کے موافق تخلی خسم کو دیکھ کر سکون محسوس کرتی ہیں۔ میں نے سرمانے کی میز سے میزک کے امتحان کی کاپیاں انھا کر دیکھان شروع کیں۔ کیسی عید اور کسی بقر عید۔ ابھی تین سو کاپیاں اور دیکھنا تھیں مگر میرا دماغ جب بھکنا شروع کرتا ہے تو ہزار گھرو پکڑ میں نہیں آتا۔ جل کر میں نے کئی بد قسمتوں کو فیل کر دیا۔ پھر کاپیاں دور پھینک کر انگڑائی لی۔ یہاں کی آب و ہوا بھی عجیب ہے۔ جیسے بڑے سے سترے ٹولئے میں نفاذ لیتی ہو۔ دن کو ایک جھلایا ہوا سرور سا! اور پھر زدن کے یہاں سے

تمقوں کے گرم گرم بھپکے! بد نصیب! مجھے پڑوسن پر رحم آنے لگا۔ ممکن ہے غریب اپنا جو ہر عصمت لٹانے پر مجبور ہو گئی ہو۔ شاید کسی ظالم نے اس کی عزت لوٹ لی ہو اور پھر وہ سربازار بکھیرنے لگی اور مجھے اس پر پار سا آگیا۔ جب بھی ہم سب بچے اماں سے کوئی کھانے پینے کی چیز جھپٹنے لگتے تو وہ بھی کھیا کر نوکرا کا نوکرا پیچ میں پنخ دیتی ہیں۔ کہ لوٹا مرا دو! بھوکو! آپ مرد گے۔ لیکن ہمیشہ نیک خیال سے یہ خیال میرے دماغ میں ریگ آیا کرتا ہے اور جوں ہی یچارہ نیک خیال او گھما۔ بد نے پھن انھیا یقیناً یہ تو جان بوجھ کر شوقیہ طوانف بنی ہو گی ستی کے مارے اور دنیا کا کچھ کام نہ ہو سکا۔ یہ پیشہ اختیار کر لیا۔ بھلا پڑوسن سے کیا سلامی ہوتی یا چکی پستی۔ سو جھمیلے ہیں دنیا کے پیشوں میں میاں جوی بچے، ساس، نند، تو ہیں بھلا کون بھگتے، بھلا یہ جوبن قائم رہتا جو پڑوسن کے بھی دو چار ساس نندیں ہوتیں توبہ کیجئے۔ ایک دن جیسے ہی فلیٹ پر پہنچی۔ پڑوسن کے یہاں کسی کے چینخنے چلانے کی آوازیں آئیں۔ سارے دن کی تھکن اس پر گھری بھر کو چین نہیں اسکول سے آکر جب تک کئی سمجھنے مردے کی طرح نہ پڑے رہو تھکن نہیں اترتی۔ معلوم ہوتا ہے کلاس میں لوگوں نے بھیج کو گئے کی گذری کی طرح مزے لے کر چبایا اور تھوک دیا۔ بڑی مشکلوں سے اس چوی ہوئی گذری کو تازہ کیجئے۔ صبح پھر نکلیے دانتوں کو سمجھئے۔ سال میں ۳۶۰ دن یہی عمل جاری رکھئے اس کے بعد وہی چوی ہوئی گذری کا پھوگ۔

” دروازہ کھلا اور وہ ایریاں نہ کھاتی ہوئی چلی آئیں آتے ہی گرجیں۔ ” میں تو عاجز آگئیں ہوں نگارے۔ اللہ جانتا ہے ایسی بھی کیا اسکول کی پڑھائی کہ ناس لگ گیا۔ ”

” او ہو تو گویا رعنیوں کے بھی نہ اس قدر ذی شس ہوتے ہیں کہ مر سکیں۔ خوب تو آپ بھی چلیں اعتراض کرنے۔ ”

” تو کیوں بھیجتی ہیں اسکول، انھا لجئے؟ ”

” اولیٰ انھا لوں؟ لو اور سنو، اے بی آج کل بے پڑھی لکھی کو کون پوچھتا ہے۔ آج کل تو بس گٹ پٹ کرتی میم چاہئے۔ ”

یہ مجھے آج معلوم ہوا اس پیشے میں بھی تعلیم یافتہ ہونے کی ضرورت ہے۔  
 شیکپیر اور درڈس درٹھ کے جوانوں کی ضرورت بھی ہوتی ہیں! بات کیا ہوئی۔  
 اسے میں نے کہا۔ بیٹی نگار آج کھڑا پاجامہ پہن لو کہ نہیں۔ جو بات ہو ہے نہیں۔  
 بس وہ موئی رفاضیں چڑھالو۔ ”میں نے کہا۔ تم سمجھاؤ شائد مان جائے۔ بات یہ ہے  
 کہ کچھ لوگ دلی لے آرہے ہیں۔ انہوں نے رازدارانہ انداز میں کہا اور میرا جی  
 چاہا ان کا لال چند رجیسا منہ نوج لوں جی یعنی میں سمجھاؤں خوب تو گویا مجھے لیں  
 میں رندی کی لاکیوں کے ہتھ کندے سکھائے گئے تھے اب بھلا بتائے یہ نکیے  
 سکھاؤں کہ بھی دلی والوں کے لئے پاجامہ پہنو گلکتہ والوں کے لئے ساڑھی اور لاہور  
 والے شلوار پسند کرتے ہیں۔ خوب اور دوسرے مجھے یہ نگار مالتی سرے سے بری  
 لگتی ہے یعنی یہ کیا ہندو مسلم اتحاد کا نمونہ ہے یہ کیا؟ بڑے بڑے لیدر چلتے ہو گئے  
 اور یہاں ایک محترمہ کی جدت پسندی نے ہندو مسلم سب کو گذرم کر کے رکھ دیا۔  
 مگر میری عادت ہے کہ میں ہمیشہ ہر شخص کو مجبور سمجھ لیتی ہوں۔ شاید لال بالوں  
 والی سنبھالی بھی مجبور ہی ہو گئی وہ۔ گڑبڑ میں یاد نہ رہا ہو اور بجائے کسی کی حق تلفی  
 کرنے کے دونوں ہی کا خیال رکھا۔ خیر تم کبھی ہماری طرف نہیں آتیں۔ انہوں نے  
 ڈھنائی سے کہا۔ قبل اس کے کہ میں روکھا جواب دوں، بولیں۔

”نگار نے نئے توڑے سیکھ لئے ہیں۔“ اگر مجھے کسی وقت رندی پر پیار آتا  
 ہے تو اس وقت جب کہ وہ ناج رہی ہو۔ اس وقت وہ مجھے میں میں اس مختنی مزدور  
 کی طرح معلوم ہوتی ہے جو پیٹ کی خاطر سرمایہ داری کے کولوں میں نیل کی طرح جاتا  
 ہوا ہو یا جیسے کوئی گرہستن چکی پیس رہی ہو۔ رقص کرنا مذاق نہیں بوئی بوئی مل جاتی  
 ہے۔ جیسے دس سیر انماج پیس لیا۔ مگر مجھے طوائف کی زندگی کے دوسرے رخ سے  
 گھمن آتی اس لئے نہیں کہ وہ کچھ مختلف ہے بالکل نہیں۔ بلکہ یا کچھ ضرورت سے  
 زیادہ مشکل ہے یا بات نہیں بلکہ یوں ہی۔

دوسرے دن میں ہمت کر کے سینھانی کے فلیٹ میں چلی گئی کہ دیکھوں اندر  
 سے لوگوں کے گھر کیسے ہوتے ہیں افوہ بس یہ سمجھ لیجئے کسی چھوٹے موٹے راجہ یا

وزیر گھر قد آدم تصویریں برهنہ عورتوں کے مجتنے۔ یہ طوائفیں، ننگی عورتوں کی تصویریں بھلا کیوں اپنے گھر میں رکھتی ہیں۔ بھلا اس سے کیا فائدہ۔ سیٹھانی تو شاید اپنے جسم کی بھیانک سلوٹوں کو سڈول۔۔۔ مجتوں کی آڑ میں رکھنا چاہتی ہیں۔ ہو گا کوئی گران لوگوں کا! نگار مجھے دیکھ کر ایسے شرمائی گویا بھی انڈاکھٹ کر باہر آئی ہے۔ اور بڑی دیر تک خرے کرنے کے بعد آئی سیٹھانی نے ڈالنا تو خیر ریکارڈ لگا کر تاپنے لگی۔ یہ رندیاں! اف میں نے ساتھا کہ اس کے جسم کو گھن لگ جاتا ہے۔ مگر سیٹھان تو لوہے کی لائٹ لگتی تھیں اور اولاد تو خدا کی پناہ۔ کیا پھر یہاں لوچدار جسم۔ جیسے ناگن انگڑا یاں لے رہی ہے۔ جب کلائی پر کلائی کی گرہ پاندھ کروہ بنجوں سے توڑے لیتی ہے تو اس کی سخنی سخنی ٹھوکروں سے ساری دنیا ہمکو رے لینے لگی۔ میرا دل لرز اٹھا۔ اف یہ ناگن جانے کتنوں کو ڈسے گی۔ نہ جانے کتنے شکار تھیں میں ٹھونے گی۔ دیے تو عورت دوسرا عورت سے وقت بے وقت جل ہی جاتی ہے۔ مگر طوائف سے خدا کی پناہ۔ عورت تو اپنا حصہ یعنی ایک مرد پا کر بازار سے ہٹ جاتی ہے۔ مگر طوائف سے چھکارا پانا آسان نہیں۔ جیسے دکان سے اناج لیتے وقت عوام تو حسب ضرورت لے کر ہٹ جاتے ہیں مگر خاص لوگ بھر بھر بورے تھے خانوں کے لکھیں میں اتار دیتے ہیں۔ نتیجہ؟۔۔۔ اگر اکنامکس پڑھی ہے تو بس سمجھ جائے اناج کی کمی تو یہ ہماری جنگ طوائفوں سے چلی آ رہی ہے۔ یہ بھی مزدور اور سرمایہ دار کی جنگ ہے۔ دکھ جھیلیں لی فانتہ اور کوئے میوہ کھائیں۔ کہتے ہیں ایک دن ایسا دکھتا ہوا آئے گا کہ سارے مزدور سرمایہ داروں کو پیس کر پھینک دیں گے اور ان کا سارا سرمایہ چھین لیں گے۔ شاید عورتیں بھی اسی طرح حملہ کر کے ایک دن طوائفوں سے سارا سرمایہ چھین لیں شاید!

شام ہوئی تو گاہک آنے لگے۔ مارے شرم کے سکڑی ایک طرف کو بیٹھی رہی کہ موقع ملے تو اڑوں کیسی یہ مجھے بھی ان میں سے ایک نہ سمجھ لیں اور یہی ہوا کہ ایک بچھے ہوئے سے ایڈیٹر صاحب انہوں نے میرے سرچپکا دیئے۔ کم بخت کچھ بول ہی نہ سکی اور اس نے میرا سودا بھی کر دیا۔ تھوڑی دیر میں پورا ہال بھر گیا۔

رنگیں عورتیں اور عیاش مرد زور زور سے قبیلے لگانے لگے ایک کونے میں چار چہرے بینہ کر پینا، جوا کھلینا شروع کر دیا۔ دوسری طرف نگار گھرے میں اوہر سے اوہر چمک رہی تھی اس پر لوگوں کی خاص توجہ تھی۔ ایک اوہیز سا مردوں اسے گود میں ٹھیکنے لیتا تھا اور وہ نہ کر انہیں مار رہی تھی۔ مگر سینھانی نے باندھ رکھا تھا گھرے رنگ کے بھڑک دار کپڑے جو دن کو بے شکر لگ رہے تھے اس وقت بہار دے رہے تھے۔ پاؤڈر سرخی سے لیس جیسی چوتھی کی دلمن دو چار کمن لڑکوں میں گھری ہوئی تازک نازک چمیں کر رہی تھیں۔ اس وقت بلا کی کمن اور حسین معلوم ہو رہی تھیں۔ متین بیٹھی تھی کہ جوانی عمر سے ہوتی ہے یا اداوں سے۔

اور اوہر وہ ایڈیٹر صاحب بیٹھے مجھے چاہ رہے تھے۔ انتہائی ترقی پسندانہ باتیں اور اس خوبصورتی سے کہ میں ہکلا ہکلا کے رہ جاؤں۔ ان کی پوری توجہ ان برهنہ تصویریوں کی طرف تھی جو میرے بستہ قریب نشگی تھیں۔ بلکہ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے جسم پر چکلی ہوئی ہیں۔ بار بار وہ انگلیوں سے تصویریوں کے خطوط چھو کر ان کے حسن و قلنچ پر بحث کر رہے تھے۔ جس کے حواب میں مجھے گھبرا کر اپنے بُوے میں کوئی نمایت ہی ضروری چیز ڈھونڈھنا پڑتی تھی۔

گھوم پھر کردہ عورتوں کے اووق مسئلہ پر آ جاتے تھے۔ اور آنکھوں میں میٹھی نہی پیدا کر کے اپنے سوکھے ہاتھوں سے سانچے ڈھال کر تشریع کر رہے تھے۔ باوجود اس قدر ڈھیٹ ہونے کے کئی دفعہ مجھے قاتلین کے نقش و نگار ڈھونڈنے پڑے۔ ہر جنبش پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ میرے جسم کو آئی کی طرح خوب پیروں سے گوند کر بھیانک سا پٹلا بناتے ہیں پھر بگاڑ دیتے ہیں۔ انہیں مجھے اس طرح نچوڑنے میں کچھ مزہ آ رہا تھا کیونکہ وہ برابر مسکرا رہے تھے جل کر کنی دفعہ جی میں آیا کہ ان کے بھی کسی حصہ جسم کا ایسا مذاق بناوں کہ ایک دفعہ تو غلیظ مسکراہٹ سے بھری آنکھیں جھینپ جھینپ جائیں مگر تندیب نے زبان پکڑ لی۔

موقع پا کر میں لپکی اپنے کمرے کی طرف۔ گلری میں ایک فوجی نوجوان نگار کو بری طرح ٹھنڈھوڑ رہا تھا۔ اور وہ اوس۔۔۔ اوس کر کے اسے کھوٹ رہی تھی۔

پنگ پر لیٹ کرنہ تو نیند ہی آسکی اور نہ ہی کچھ کام ہو سکا۔ دوسرے دن ان پکڑیں آنے والی تھی۔ مجھے اس کو رجھانے کے لئے سو سو بناو کرنا تھے۔ سبق موڑ ہو انداز گفتگو مرعوب کن، لباس مبدaranہ اور چال ڈھال میں نرمی امیرانہ دبوبہ۔ جماعت کی توجہ بورڈ کا استعمال۔ سوال و جواب کی اہمیت، میرے معزز پیشے کے شریفانہ گر! لیٹے لیٹے میں یونی ورزش کرنے لگی۔ پھر ایک دم مجھے خیال آیا جو کوئی مجھے اس طرح دیکھ لے تو کسی کی موجودگی کے خیال سے مجھے ایک دم تنائی کا شدید احساس ہوا۔ میں کتنی اکیلی ہوں سوائے ان قہقتوں کے جو میب چنانوں کی طرح سیٹھانی کے فلیٹ سے لاٹھک کر میرے دماغ سے نکلا رہے تھے۔ گھنگھروں کی جھنکار اور تالیوں کی آوازیں ایک بارگی میرے جسم میں رینگ کر ہزار سبضوں کی طرح پھر پھرہا نے لگیں اور پھر بدی نے دماغ میں کروٹیں لیتا شروع کیں۔ اگر ان کروٹوں کا ایک رخ بھی کسی کو دکھائی دے جائے تو نہ جانے کیا ہو۔ میں ایس خوف سے لرزا کرتی ہوں۔ مثلا یہی کہ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے سیٹھانی بن سنور کر اپنے گاہوں کو پیٹ کی خاطر بھاتی ہیں۔ میں بھی کیل کانٹے سے درست ہو کر اپنے گاہوں کے دربار میں جاتی ہوں۔ فرق اتنا ہے کہ میری عقل، وہی چوسی ہوئی گندیری، اور سیٹھانی۔۔۔ یعنی مکمل اس کا گھڑا۔ میں دماغ بیچتی ہوں، سیٹھانی جسم! اور میرے دماغ کا مول سیکنڈ ہینڈ ٹائر کے برابر لعفی ست روپیہ اور سیٹھانی اپنی ایک انگڑائی میں اتنا کمالیتی ہیں کہ میرے ابا حکومت برطانیہ کے اعلیٰ افسر ہونے کے باوجود ساری عمر میں نہ کہا سکے۔ ہم دونوں ہی بازار میں اپنے اپنے خوانچے لگائے بیٹھی ہیں۔ مال مختلف مگر مقصد وہی۔ میرے مر جھائے ہوئے دماغ کی حیثیت ان کے وسیع جسم کے آگے ایسی ہی ہے جیسے پان بیڑی کی دوکان کے آگے کرکٹ کلب۔ یقیناً میرا سودا برا رہا۔ اور میں جلنے لگی۔ اپنے تخیل سے بھڑکائی ہوئی آگ میں لوگوں کو طوائف پر رحم آتا ہے۔ ان کو سمجھانے کی فکر میں ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ غائب ہو جائیں۔ نہیں جو بڑی گت سے ہیں ان کے دن پھر جائیں۔ ان کے میلے کپڑے زرق برق ہو جائیں سڑے سے گندی نالیوں کے پاس جو مکان ہیں وہ میرین ڈرائیو

پر پہنچ جائیں۔ گاہک آئیں مگر اتنے کہ ان کا جی میلا ہو جائے اور یہاں تھواہ کا گریدہ ہر سال گر جائے کچھ پرواہ نہیں۔ طالب علموں یا دوسرے لفظوں میں دوزخ کے دروغوں کی تعداد دو گنی ہو جائے ہیڈ معدہ چوس ڈالے۔ دفتر کے کلرک بجنبوڑ ڈالیں۔

کمیٹی کے ممبر ڈکار جائیں۔ کچھ پرواہ نہیں۔ استانیاں بچوں کے دماغ بنارہی ہیں تو طوائیں لاوارثوں کے دل کی مھنڈک دونوں ہی اپنا اپنا کام کر رہی ہیں پھر۔۔۔ پھر یہ کیوں؟

جب رات بھر اتنی دماغی کشتی لڑی ہو تو انسپکٹریں کے سامنے کیا ناز و ادا چلیں۔ نتیجہ یہ کہ اس سال۔۔۔ جو مستقل ہونے کی امیدیں تھیں رخصت! جو مسلسل روح فرسائی کا ارمان تھا ختم! اف جس نے اپنی زندگی، ہی قوم پر قربان کرنے کے لئے وقف کر دی ہو وہ۔ مگر قوم ان ادھ مری گایوں کو گھن لگا چکی تھی۔ یہ بیمار بکریاں۔ ان سے قوم کو قتے آتی ہے! دوسرے دن سینھانی پھر آن پہنچیں اور مجھے ایسے نصیحت کرنے لگیں کہ کوتی میں بھی ان کے پڑوس کی ہوں۔ اور انہوں نے اندھا دھنڈ زندگی گزار رہی ہوں۔

اے ہے بس، ہر وقت پڑھا۔ اللہ مارا دماغ بھی مل جائے۔ میں مننا کر چپ ہو رہی۔

دیکھو تو کیا شکل نکل آئی ہے۔ انہوں نے رحم کھانا شروع کیا اور میرے دل میں بغاوت کا بھوت ناچا۔ یہ مجھے کیوں چھیڑتی ہیں۔ خواہ مخواہ یا اللہ یہ میں کہاں آگئی ہوں۔ اوپر سے تو۔ یہ عمارت بالکل شریفوں کے رہنے کی معلوم ہوتی ہے بورڈ پر نام بھی شریفوں جیسے ہیں۔ مس کو نیزو، مس واکر۔ مسز عبد اللہ مس رشید۔ مسز۔۔۔!

وہ حمید صاحب تم سے ملنے کو کہتے تھے، یہ وہی ایڈیٹر صاحب تھے! ارے تو کیا اس نے واقعی مجھ سے پیشہ کرانے کا فیصلہ کر لیا؟ یعنی اپنے گاہوں میں سے مریل چھانٹ کر مجھے دیتی جائے گی۔

”بھئی آج تمہیں ضرور سینما لے کر جاؤں گی۔“ وہ انھلائیں۔ ”مگر مجھے تو۔“ واضح رہے میرا پیشہ باعزت ہونے کے علاوہ کافی محنت طلب ہے۔

”ارے ہٹاؤ بھی تمہیں تو ہر وقت کام رہتا ہے۔ حمید صاحب تمہارے لئے خاص طور پر پاس لائے ہیں اور تم ہو کہ ٹال رہی ہو۔ ارے یہی تو ہنسنے کی عمر ہے۔“

”یا مولی! تو اب میرا مذب پیشہ ختم اور یہ ہنسنے بولنے کا پیشہ شروع؟ تو ہے اگر میری اماں بیچاری کو معلوم ہو تو کیا حال ہو ان کا۔ کہ ان کی نیک بیٹی کو بہکایا جا رہا ہے اور یہاں تو سودے بھی ہو گئے آج پاس آ رہے ہیں کل بنارسی سازی اور پرسوں ہیرے کے بندے نور ترسوں وہ خود معہ اپنے مصورانہ خیالات کے اور وہ پھر ان کے سوکھے اور کھردے ہاتھوں سے سانچے بنانا کر۔ اللہ!“

میں نے رکھائی سے انکار کر دیا اور وہ مضھل سی بڑھاتی پہنچ گئی۔

تو ہے ایسا بھی کیا۔ جبھی تو کہتے ہیں اتنا پڑھانا لکھانا بھی اچھا نہیں لڑکیوں کا۔

”جی ہاں! کیوں نہیں۔ پڑھ لکھ کر کریں ہی کیا۔ آپ کا لطیف پیشہ سلامت رہے۔ کیا ضرورت ہے کہ دماغ پچھی کرے کوئی؟ میری سمجھ میں نہیں آیا باوجود اتنی بد مزاجی کے مجھ میں کیا دلچسپی ہے جو بار بار پڑوسن آتی تھیں!“

میں کا پیاں درست کرنے لگی۔ یا خدا یہ فیل ہونے والے بھی جان جان کر جلاتے ہیں۔ جی چاہتا ہے صفر سے بھی کوئی ذیل تعداد ہو تو وہ نکال کر دوں ان کو۔ مرس کہنگت۔ جی چاہا۔ جو فیل نہیں ہوئی ہیں انہیں بھی فیل کر دوں تاکہ سب کی سب سینھانی کی طرح تباہی کے غار میں گر پڑیں۔

پھر ایکدم سے میں نے سوچا نہیں۔ یہ تو نہایت ہی عجیب سزا ہو گی۔ بہتر یہی ہے کہ میں انہیں اپنی طرح قوم کی خدمت کے لئے باہم استانیاں بنادوں تاکہ، تاکہ، وہ بھی۔۔۔!

آگے سوچنے کی طاقت زنگیاں کر رہ گئی۔ سینھانی اور نگار نہتی کھلکھلاتی حمید صاحب اور دو چار دوسرے بھنکتے ہوئے غاشتوں کے ساتھ سینما گئیں۔ جب وہ

آئیں تب بھی میں جاگ رہی تھی۔ جہاں غنوڈی آئی اور عفترتوں نے دانت نکال کر حملہ کیا۔ بھلا اس طرح کون کام کر سکتا ہے۔ دو چار دن اور رہی رندی کے پڑوس میں تو نجانے کیا ہو۔ میں خیالات میں دن بدن الجھتی جا رہی تھی خود اپنے ضمیر سے بات کرتے ذر لگتا تھا جانے کمیخت کیا بول انھے۔

میں سر پکڑے پنگ پر بیٹھی رہی۔ تھکی ہاری۔ سینھانی سو گنی تھی۔ فلیٹ پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چند وابحیات خیالات دل میں جھانکنے لگے۔ ذرا ڈھیل دی تو ریلے کا ریلانٹ پڑا۔ قیقہ میرے دماغ سے ابلجھنے لگا۔ عزت پاکبازی، گندے انڈے کی طرح پونے کے پیچے دبائے بیٹھے رہو۔ تو کیا اس میں سے سرخاب نکلے گا؟ اور پھر تماشہ یہ کہ کوئی بھی اس گندے انڈے کی سیوا کا پھل نہیں رہتا۔ قوم کو ذرا بھی احساس نہیں کہ ایک دلویں پار سالی کا پیارہ انھائے تو یہ جی چاہا کہ انھا کرچ سڑک پر ایسی جگہ پر پھوڑوں کہ ہر آنے جانے والا غلطت سے لکھر جائے۔

یہ مجھے کیا ہو رہا تھا۔ یہ سب اس رندی کے پڑوس میں رہنے سے ہوا! مجھے فوراً اپنی سیلی بینا یاد آگئیں اف کتنی حسین اور چلبی تھی! اور وہ پھر مسلسل پڑھتی رہی۔ اور پھر ایک دن بوکھلا کے اس نے ایک غلیظ بوڑھے سے شادی کر لی۔ وہ تو کہتی تھی کہ۔ اس کی قومی خدمات کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو گئی تھی وہ سولہ برس جیل کاٹ کر آیا تھا اور کسی زمانے میں حسین بھی تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ مینا قوم کی خدمت کی آڑنے لے رہی ہے جیسے سینھانی برہنہ تصویروں کی آڑ لیتی ہے۔ وہاں صبح بھوکھ میں کو آڑ یاڑ ہو جاتے ہیں۔ میں نے پکا ارادہ کرایا کہ فلیٹ بدلت دوں گی ورنہ جو ہر بے بنا کچڑ میں جا پڑے گا۔ اور وہ دولت جس کے پیچے مشرقی عورت جان دیتی ہے مٹی میں مل جائے گی۔ دنیا میں عورت کے پاس یہ عصمت ہی تو ایک شے ہے۔ جسے کوئی پیٹ کی خاطر لنا تی ہے تو کوئی اس کی جان لنا دیتی ہے۔ لے دے کے یہی ایک تپ کا اکہ ہے جو ہر داؤں پر مار سکتی ہے کم۔

صبح انھ کر جب میں پیچے جانے لگی تو سینھانی پھل والے سے کھڑی الجھ رہی

تھیں۔ مجھے دیکھ کر غیروں کی طرح منہ پھیر لیا۔ فخر سے میرا سرا اونچا ہو گیا۔ آخر کو اسے معلوم ہو ہی گیا کہ میں شریف ہوں!



# تل

”چودھری اے چودھری۔ سنو۔“

گنیش چندر چودھری چپ تھا۔

”شش۔“

”--- کیا جھینگر کی طرح شی شی کرے جا رہی ہو۔“

”بھئی میں تھک گئی جو۔“

”چلکی بیٹھے گی کہ۔“

”مجھ سے نہیں بیٹھا جاتا۔ وہ ساری پیٹھ تختہ ہو گئی۔ ہائے رام“  
} ”ہنک۔ ہنک۔“

”چچ چچ۔“

”مجھے سردی لگ رہی ہے۔“

چودھری چپ۔

} ”سہال نجھ کو لوں میں چپو نیاں سی کاٹ رہی ہیں۔“

”دیکھ رانی دس منٹ بھی نہیں ہوئے اور تو تھک گئی۔“

”اور کیا۔ کوئی میں مٹی کی بنی ہوں، واہ۔“ رانی نے اپنے موٹے ہونٹ پھیلائے۔ اور سنگ مرمر کی چوکی سے نیچے پھسل گئی۔

”جیل۔ کہتا ہوں سیدھی بیٹھ۔ حرامزادی۔“ چودھری نے رنگوں کی تھائی اسنوں پر چلی اور رانی کے کندھے پکڑ کر دو چار جھٹکے دیئے۔

”تو۔ تو۔ تو پھر لو۔“ وہ زمین پر لمبی لیٹ گئی۔ چودھری جل کر کوئلہ ہو گیا۔  
} اس کا جی چاہا رانی کے چکنے چکنے سیاہ گالوں پر کھڑی کھڑی نچیاں مارے۔ مگر وہ جانتا تھا پھر تو وہ بالکل ہی قابو سے باہر ہو جائے گی اور بہانہ کر کے رو نے لگی گی۔ اور پھر

وہ تصور جس کے لئے وہ اتنی جان ماری کر رہا تھا نامکمل رہ جائے گی۔

”دیکھو تھوڑی دیر اور بیٹھی رہ۔ اور پھر۔“ چودھری نرمی سے بولا۔  
} ”تھک گئی تا۔“ وہ لوٹ کر جست ہو گئی۔

”تھک گئی! اور جو سڑک پر دن بھر گوہر بینتی تھی تو نہیں تھکتی تھی۔“  
کتنا کمیں کی۔“ چودھری کو پھر غصہ چڑھا۔

”کون بنتا تھا گوہر۔ تم بنتے ہو گے۔ واہ کسے سارے نندوں کے سے طعنے  
دیتے ہو۔“ وہ روٹھ کر بیٹھ گئی اور چودھری کو یقین ہو گیا کہ آج کا دن تو گیا ہاتھ

”اچھا دیکھو گھری رکھی ہے یہ۔ بس آدھا گھنٹہ، سمجھی۔“

”آدھا گھنٹہ نہیں۔ بس چھ منٹ۔“ وہ چوکی پر چڑھتی ہوئی بولی بات یہ تھی  
کہون کہ چھ سات سے زیادہ تو اسے خنتی بھی نہ آتی تھی اور چودھری خوب جانتا تھا کہ  
اپنے کو اپنے لوز کچھ منٹ کے بجائے وہ اسے آدھا گھنٹہ جمائے رکھے گا۔ رانی نے کمر کو کھینچ کر لمبا کیا  
بخاراں دریا ہے۔ اور بھاری پھولدار ملکی کندھے پر رکھی اور بیٹھ گئی مگر کتنی دیر کے لئے۔  
} ”نھیک ہے نا۔“

”ہا۔“ چودھری جلدی سے جھک گیا۔

”دیکھو تو۔“

”ہا ہا نھیک ہے۔“

”دیکھو تو۔“

”ہا ہا نھیک ہے۔“

”تھوڑی دیر خاموشی سے برش چلتے رہے، رنگ پر رنگ دوڑتے رہے مگر کوئی  
ڈیڑھ منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ رانی نے لمبی لمبی سانس لی۔

”ہا۔ بس چودھری۔ ہو گئے چھ منٹ۔“

”ہوں ہنک۔“ وہ جلدی جلدی کبھی اسے اور کبھی ادھ بی دھیوں والی تصویر  
کو دیکھنے لگا۔

”سردی لگ رہی ہے چدر اوڑھ لوں؟“  
”نہیں۔“

"آ۔ آ۔ یے۔ جاڑا" وہ کتوں کی طرح رونے لگی۔ چودھری چپ۔  
"کمر۔ کمر۔ میری کمر رے۔ چودھری جی!" اصل میں وہ آج شرار۔  
- ۱ -

”چدر- چدر- میری چدر-  
چودھری چپ-

"ہوں۔ کہہ رہی ہوں میں تھک گئی۔ اب یہ ہندڑا پختگی ہوں۔ ہاں نہیں

تو۔ ”چودھری جلدی سے مڑا، وہ یہ تصور مکمل کرنے کے لئے ہندو عجائب خانے کے مانگ کر لایا تھا۔ اگر رانی توڑ دے تو بس سمجھ لو کہ رانی کی کھوپڑی کی خیر نہیں۔

"تو پھر تھک جو گئی۔ جو کاٹ رہی ہے چودھری۔" وہ اپنے گھنے بالوں کو  
البھانے لگی۔ اور پھولدار ملکی نیچے نکا دی۔ "چودھری نے تیر دور دور رکھ لئے  
آنکھیں چھما کر لٹوکی طرح باہر نکال لیں اور غصے سے اس کے چہرے کا گوشت  
پھز کنے لگا۔ اس کی پسندیدہ چھدری داڑھی کشتی کے بادبان کی طرح لرا نے لگی۔  
جیسے بڑا بھاری طوفان آنے پر سفید سفید بادبان ملتے ہیں۔ اور اس کی چمنی چکنی  
کھوپڑی پر پینے کی بوندیں پھوٹ آئیں۔

”لیئے لیئے کمر تو دکھ گئی۔“ رانی نے ڈر کر جلدی سہاپنی نشست نھیک کر لی اور پھر وہ ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"او، او، او، هر که وہ ہونٹ بجا کر ڈکرائی۔" دو دو دو کوئی مر

بھی جائے تو بھی۔ دور دور پر رہ۔“

چودھری نے آنکھیں پھاڑ کر اسے گھورا۔ جب کبھی وہ رونے لگتی تو چودھری کے رخملروں کی مچھلیاں پھر کرنے لگتیں اور تاک کا باسہ ٹینٹھا ہونے لگتا اور برشا<sup>بڑا</sup> ہاتھوں میں پھلمبڑی کی طرح ناپنے لگتے۔ طشتہ کے سارے رنگ ایک دوسرے میں گزندہ ہو کر ایک خلا میں تبدیل ہو جاتے اور اسے کچھ نہ سوچتا اور یہ کرب کرنا

حالت اس پر اس وقت تک طاری رہتی، جب تک اس کے دماغ سے بحثتا ہوا کانٹا نہ نکل جاتا اور رانی کی حرکتیں اس وقت کاٹنے نہیں بھالا بن کر اس کی ہستی کے آر پار نکلی چارہی تھیں۔

ہر ذمی روح پر چودھری کے اس دپورے کا پورا پورا اثر ہوتا تھا چنانچہ رانی بھی نہ بچ سکی۔ اس نے پھر اپنے پیٹ کو پھکایا اور ہونٹوں سے پھر کئی سی آوازیں نکلتی ہوئی سیدھی ہوئیں۔

تمہاری دیر تک دنیا پھر اپنے محور بر گھومتی رہی۔ چودھری کا برش پائے بھرتا رہا۔ رنگ کی تھالی گندی اور مدد شکل ہوتی گئی۔ لیکن۔

”چودھری“ اس دفعہ رانی پیار سے بولی۔ چودھری کی بغل میں جیسے چوہا سا کودا۔ دنیا کے ایک محور کا پایہ ذرا سا لچکا۔ جانے بھائی محور میں پائے لگئے ہوتے ہیں (۱۴) کہ نہیں۔ لیکن ہوا کچھ نہ کچھ ضرور!

”چودھری تم نے یہ دیکھا ہے؟“

چودھری کے کندھے جھر جھرائے اور چکنی ڈلی کی شکل میں کھوپڑی میں پینے کے دانے پھوٹ نکلے۔ وہ پھر بولی۔

”دیکھو۔۔۔ یہ کالا تل۔۔۔ یہ دیکھو گردن سے ذرا نچے۔۔۔ اور نیچے ذرا الٹی طرف۔۔۔“ ایک ہاتھ سے مٹکی پکڑ کر اور ہونٹ لٹکا کروہ اپنی گردن سے جھانکنے لگی۔

”دیکھا ہے یہ تل۔۔۔ اور تم تو دیکھ رہے ہو چودھری۔۔۔“ وہ بن کر شرمانے لگی۔ ”واہ مجھے تو شرم آتی ہے۔“

”سیدھی بیٹھ۔۔۔“ چودھری غرایا۔

”اوی۔۔۔ بڑے آئے۔۔۔ بھلا کوئی کسی کا تل بھی دیکھتا ہو گا۔ اور جب وہ ایسی بڑی جگہ ہو۔۔۔ ہی۔۔۔ ہی۔۔۔“ وہ اترائی۔

”میں نے تل دل کچھ نہیں دیکھا اور نہ دیکھوں۔۔۔“ بد مزاجی بڑھی۔

”ہوں۔۔۔ جھوٹے۔۔۔ سراسر کاٹری آنکھ کر کے دیکھ رہے ہیں اور ہی

ہی۔ ”وہ آوارہ عورتوں کی طرح انھلائی۔

”رانی!“

رانی نے صرف تاک اچھا دی۔ چودھری مغلوب ہو کر کاٹھ کے ڈبے پر بیٹھ گیا۔ ”تجھے معلوم ہے کہ میں کتنا بڑا ہوں۔“

”ہائے رام۔ کوئی۔ کتنے بڑے؟“ وہ بھی منکی جھکا کر آگے بڑھی۔

”میں تیرے باپ بلکہ دادا کے برابر ہوں۔ اور تو تو بنا کتنی ہو گی؟“

”پندرہ برس سے آگے نہیں اور تجھے یہ بدمعاشی کی باتیں کس نے پڑا؟“

چودھری دادا برابر تو کیا اس کے باپ برابر بھی نہیں ہو سکتا۔ ذرا معاشرے کو دبلنے کے لئے کہہ دیا تھا اس نے۔

”اویں۔۔۔ بدمعاشی کی باتیں تو تم کرتے ہو۔۔۔ کہ تل دیکھتے ہو۔ ایسی بری جگہ تو تل ہے۔“ وہ آہستہ آہستہ تل مٹو لئے گئی۔

”ذراسی چھو کری۔“

”ذراسی کا ہے کو ہوں واہ۔ ذراسی کتنے رہتے ہو۔ ذراسی ہوتی تو۔“

”تو۔ تو؟۔ تو کیا؟“

”رتنا کہتا ہے جس کی چھاتی پر تل ہوتا ہے وہ۔ وہ۔“

”رتنا؟ یہ رتنا کو کیسے معلوم کہ تیرے کماں کماں تل ہے۔“

”میں نے دکھایا تھا“ وہ تل کو آہستہ آہستہ سملانے لگی۔

”تونے۔ تو۔ تو۔ تو نے رتنا کو دکھایا تھا تل؟“

چودھری کا پھر خون لکھلایا اور بغلوں میں چوہے پھد کے اور گالوں کا گوشہ

پھر برش چھپھڑی کی طرح تحریر کئے لگا اور رنگ ملنے شروع ہوئے۔

”آ۔ تو۔ واہ۔ اس نے دیکھے لیا تو میں کیا کرتی۔“

”کیسے۔ کیسے دیکھے لیا تل اس نے جب کہ تو۔“ چودھری کی بتنی ڈھیلے بڑھا کواڑوں کی طرح بختے گئی۔

”نمارہی تھی میں تو اس نے“ اس نے منکی سنبھالی اور نشست پر جنے لگی۔  
 ”ہاں تلیا پر نمارہی تھی۔ مجھے ایسے ڈر لگا کہ کوئی آنہ جائے۔ اس کے میں  
 اسے سنک لے گئی تھی۔ کوئی آ جاتا تو۔ میں نمارہی تھی۔ شلوکا بھی دھوایا تھا۔ مجھے  
 ڈر لگا کہ کوئی آنہ جائے اس لئے اسے لے گئی۔ ہاں۔“ اس نے بھولپن سے فیصلہ  
 کیا۔

”رانی“ وہ آگے بڑھا۔

”آں میں نے اس سے کہہ دیا تھا ادھر منہ رکھیو۔ مگر“  
 ”مگر؟“

”مگر وہ دور بیٹھا رہا۔ پھر میں نے کہا“ رتنا میرے تل ہے۔ بڑی بڑی جگہ۔ وہ  
 بولا نہیں۔ تو میں نے بولا نہیں دیکھتا تو مت دیکھے ہاں بھی مجھے کیا۔ کیوں  
 چودھری؟“

”پھر تو کیسے کہتی ہے، اس نے تل دیکھا؟“  
 ”ہاں پھر میں ڈوبنے جو گئی۔ پانی اتا آتا گرا تھا۔“ وہ تل سے ذرا نیچے انگلیاں  
 رکھ کر بولی۔

”قطامہ!“ چودھری برش پھینک کر لڑکی کی طرف چلا۔

”ہائے رام۔ پھر پھر سنو تو۔ چودھری۔ تو کیا میں ڈوب جاتی؟“

”تجھے تیرنا نہیں آتا کرتیا! رات دن ہو دی میں جو ڈبکیاں لگاتی تھی۔ تب نہ  
 ڈوب مری!“

”واہ۔ واہ میں کیوں ڈو ہی۔ میں۔ میں تو تل دکھارہی تھی!“  
 کیوں کردا ہا؟ ”تو نے تل دکھانے کے لئے بہانہ کیا تھا“ چودھری نے تسلی سی چھپی ہوئی میں  
 نچائی۔ وہ اب مسکرا رہا تھا۔

”ہائے رام مجھے دھوتی تو اوڑھ لینے دو۔ چودھری جی“ وہ بندیریا کی طرح  
 اچک کر کھاث پر جا کھڑی ہوئی۔

”جو تم مارو چکے تو سڑک پر بھاگ جاؤ گی چودھری، مجھے شرم آئے گی میں

کہہ دوں گی چودھری۔ چودھری۔“

بڈھارک گیا ”کیا کہہ دے گی؟“

”میں کہہ دوں گی چودھری کہتا ہے میراں ام ام۔“

”لمحی!“ چودھری پاگل گیدڑ کی طرح ناپنے لگا۔ رانی سمجھ گئی کہ تیرنا شانے پر

بیٹھا۔

سب سے کہہ دوں گی سنا چودھری! مارو تم مجھے۔ مار کے بھی دیکھے لو۔ واہ ایسے کیوں گھور رہے ہو۔ اتنی تو چھوٹی ہوں ذرا سی چھوکری بڑے خراب ہو تم جی۔“ وہ ملکے ملکے دروازے کی طرف بڑھنے لگی اور چودھری سر پکڑ کر بینہ گیا۔ ایک دفعہ تو جی میں آیا انہ کر تصوری میں تو لگا دے آگ اور رانی کو اتنا کوئے اتنا کوئے کہ پھومربنا دے۔ مگر پھر اسے نمائش یاد آگئی جس میں اسے پانچ ہزار روپے کا انعام طلنے والا تھا۔ ایک تو اس کا سرویس ہی گھوم رہا تھا۔ وہ تصوریں تو بنا نے لگا تھا اور ہزاروں تصوریں بنا کر چھوڑ دی تھیں۔ اس نے کھلتے ہوئے گلب کا شرمایا ہوا رنگ، نہ مارتا ہوا سبزہ، ناچتا تھر کتا آبشار بھی بنایا تھا۔ اس نے سرو آہوں اور بھجنی خوشبو تک کو رنگ میں سو کر رکھا تھا۔ دور دور کے ملکوں کی ننگی اور آرائستہ و پیراستہ عورتیں بھی اس کے سامنے گھنٹوں بیٹھنے کا فخر حاصل کر چکی تھیں مگر یہ چبلی صندل گنوار چھوکری جسے اس نے سوری کی غلاۃت سے بڑی مصیبت تو یہ تھی کہ ہزاروں رنگ لتمیزے چہ بھی وہ اس کے جسم جیسا مسئلہ تیار نہ کر سکا۔ اس نے سیاہی میں بکھر کر صندل گھول کر اس میں نیلا رنگ ملا دیا۔ پھر بھی اس کے رنگ کی چمک آبنوسی صندلی، نسلی اور کچھ بادا میں لہر لئے ہوئے تھی۔ ایک مصیبت ہوتی تو خیر۔ آج اس کا رنگ سرمی ہوتا تو دوسرے دن اس میں سے شفقتی سرنخ پھونٹنے لگتی اور پھر بھجنی اچھا کرنا۔ اس کا جسم ثتم ہوتی ہوئی رات کی طرح اودی اودی گھناؤں سے ملنے لگتا اور ایک بھی نہ جانے کہاں سے اس میں سائب کے زہر کی سی نیلا ہٹھ جھلکنے لگتی اور بہر گئی۔ اس آنکھیں بھی مگر گٹ کی طرح رنگ بدلتیں اس نے پہلے دن نہایت اطمینان سے کولتار کا سایاہ رنگ تیار کیا لیکن پھر اسے تکلی کے گرد لال لال ذورے نظر آئے۔

اور پھر ان ڈوں کے آس پاس کی زمین بادلوں کی طرح نیلی معلوم ہونے لگی۔ وہ جنم جلا گیا اور ڈھیر سارنگ بیکار گیا لیکن اس کے غصے کی وجہ تو انتہا ہی نہ رہی (جب) اس نے دیکھا کہ ذرا سی دیر میں کولتار جیسی پتلیاں سبز ہونے لگیں اور ہوتے ہوتے دو زمرد کی ڈلیوں کی طرح ناپنے لگیں۔ ڈلیوں کے آس پاس کامیدان دو دھیا سفید ہو گیا اور ڈور سے قرمی ہو گئے۔ اف وہ سر پکڑ کر جھومنے لگا۔ اور اور پڑتے یہ پاتیں:

”مچھر کاٹ گیا۔“ وہ بچوں کی طرح منمنائی۔

آج چودھری نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ گھنی سادھ جائے گا اور لوٹے گا ہی نہیں۔

”اتنے مجھے کانتے ہیں کہ کیا بتاؤ۔ یہ مچھر۔“

چودھری چپ۔

ہائے رے، کیسے کانتے ہیں یہ مچھر۔“ اس نے مولی کی ایک بازاری گالی کی جو کچھ عام بھی نہیں تھی۔ چودھری اچھل پڑا۔ گالی! یعنی یہ لڑکی ہو کر اتنی مولی گالی جانتی ہے۔ وہ خود سوائے جنہ بالکل زبان نہ ڈالیوں کے ایک بھی عربی قسم کی گالی نہ جانتا تھا اس نے کبھی کبھی گالیوں کے مسئلے پر غور ہی نہیں کیا یہ گالی تو شاید دار و نہ جی کو بھی نہیں آتی ہوگی وہ بھی جنہ الفاظ استعارے کے طور پر استعمال کر لیتے ہیں محض ضرورتا۔“

”یہ تو نے گالیاں کہاں سے سیکھیں“ وہ مرگ کیا۔

لگر ”کونسی ہے“ اس نے بھولیں سے گالی دھرائی۔

”رانی“ وہ بھیکا۔

چوتھے ”پشن نے دی تھی ایک دفعہ مچھروں کو۔ اس کی کھوی میں بہت مچھر ہیں۔“ وہ بات مانے لگی۔

”اس کی کھوی۔ تو اس کی کھوی میں بھی کئی تھی؟“

”ہاں وہ لے گیا تھا کہ چل گئے رہائی کھائے گی۔“

پھر گزدھانی کھائی تو نے؟

”کماں گزدھانی تھی بھی نہیں۔ جھوٹ پول رہا تھا مگر اب لا دیتا ہے“۔ کم خوب!

”مجھ پر چتن گزدھانی لا دیتا ہے؟“

”ہاں اور کھلیبی بھی“۔ وہ مغلی پر نقش و نگار ڈالنے لگی۔

”اور کھلیں!“ چودھری جانتا تھا کہ وہ بیکار حیرت زده ہو رہا ہے۔ رانی گزدھانی پر فریفٹہ تھی۔ وہ چتن کی کھوی چھوڑ موری میں کتوں کے جزوں سے گزدھانی نکال کر کھا سکتی تھی۔

”میں نے تجھے پیسے دیئے پھر بھی تو چتن سے گزدھانی لیتی ہے۔“

”اوں میں کب لیتی ہوں۔ میں کوئی منگتی ہوں، وہی دیتا ہے کہتا ہے چل کھوی میں مجھے تو وہ آپ برا لگتا ہے۔ ایسی بڑی بڑی موچھیں ہیں مجھے تو چھینکیں آنے لگتی ہیں۔ خون، خون“ وہ ناک سکیر کر پھر پھر انے الگی جسے کسی نے اس کے ناک میں لیتی کر دی ہو۔

”زرا پیچھے کھالوں چودھری“ پھر چودھری پر وہ دورانی کیفیتیں چھانے لگیں۔

بھیجے میں تالیاں سی بنجنے لگیں اور گال اور پرنسپے کو دنے لگے۔ پانچ ہزار روپے چھتن میں اس سے دور نہیں نہیں تاروں کی طرح ناچ کر بھاگنے لگے۔ بھورا، کالا، سرمی اور چیلا سب رنگ ایک دوسرے سے دست بوجگر بیان ہونے لگے۔ اور کھوپڑی پر آبلے سے ابھر آئے.....

اب سوال یہ تھا کہ تصویر بنائے یا پاگل ہو جائے۔ اگر یہی چال رہی تو وہ دن دور نہیں تھا جب وہ سچ مجھ کپڑے پھاڑ کر سڑک پر باولے کتے کی طرح لوٹ لوٹ کر اپنا سوکھا مارا جسم چھیل ڈالے اور اپنے دیکتے ہوئے سر کو تلیا کے پانی میں ڈبو نہ لے جو ہے۔ یوں ہی اس کے قدم تلیا کی طرف اٹھ گئے۔ تلیا دور نہ تھی۔ عموماً وہ وہاں گھنٹوں ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں کو سطح آب پر تھر کتے نہیں دیکھنے چلا جایا کرتا تھا اور وہ شاعر تھا، پیدائشی شاعر۔ وہ دنیا میں تو رہتا تھا مگر دنیا سے کتنا دور۔ بذھاتو وہ نہ تھا مگر جوان بھی اسے کوئی نہ کہہ سکتا تھا لیں نہ داڑھی لاء پرواہی کی وجہ پر چھوڑ

رکھی تھی اور وہ کچھ یوں ملکی چیزیں کی چلی تھی۔ ”اوہ“ پھر اس کی بغلوں میں کوئی چیز پھر پھرائی۔ رانی کی آواز ایک بھراٹی ہوئی مینڈک کی آواز کے ساتھ آئی۔ مینڈک ہی ہو گا اور کیا برسات۔ خیر برسات تو دور تھی۔ مگر نہیں مینڈک نہیں بلی خرخاتی ہو گی۔ بلی تو کیا ہاں کچھ ہو گا ضرور لیکن جب اس کی پارسا آنکھوں نے رانی کو رتنا کے ساتھ پانی میں چمٹ لیں کرتے دیکھا تو تھوڑی دری کسلئے وہ اسے بھی اپنے تخیل کا فریب سمجھا۔ تخیل اسے چھیڑنے کسلئے طرح طرح کے بھانے تراشا کرتا تھا۔ آج تو حد ہی کر دی تھی۔

لیکن جب وہ آگے بڑھا تو نہیں کے زمزدے رک گئے اور وہ حیرت زدہ رنگ موسیٰ کے سے مجستے آنکھیں پھاڑنے لگے۔ کس قدر صاف تھا وہ اہمہ بالکل بال بال صاف، رتنا کے پھوٹوں کا ابھار۔ پانی سے بھیگی ہوئی اس کی لمبی چوٹی۔ قریب قریب رشنا اور رانی { بیٹھی ہوئی دو آنکھیں اور رانی کی الجھی ہوئی چوٹی۔ وہ سرمنی، عنابی، صندلی، کافوری اور نلے رنگ کی آمیزش سے بنا ہوا جسم اور مل! وہ مل ابھرا ہوا۔ گولی کی طرح چودھری کے سینے میں کھٹ سے لگا۔ ایک طرف کو سرکتا بچتا رتنا تو نکل بھاگا، دھوئی اٹھا کر اور رانی لیری سے کھڑی چھپ چھپ کرتی رہی۔ چودھری کو معلوم ہوا کہ مکھی اسے جھوٹے میں ڈال کر لمبی لمبی ٹینکیں دے رہا ہے۔

”تل دلکھ رہے ہو میرا“ بڑے بڑے ہو جی۔ وہ منانے کلئے اٹھانے لگی۔

”بآہر نکل“ اس نے اس نے چودھری کو ڈھکلتے ہوئے کہا جو دھیسے دھیسے ڈوتا جا رہا تھا۔

”اوہ۔ تم مارو گے۔“ وہ پانی میں سے اوپر ابھر آئی۔

”آج تجھے ادھیز کرنہ ڈال دوں تو میرا نام چودھری نہیں“۔ چودھری نے خود کو یقین دلا�ا کہ یہ وہی تجھوکری تھی جو کچھ میں مینڈک کی طرح پل رہی تھی۔

”عورت پر پاتھ اٹھاتے ہوئے شرم نہیں آئے گی۔“ چودھری سلگ گیا۔

”نگلی عورتوں کو پہنچتے ہو۔ واہ!“ وہ اور اوپر ابھری۔

”شرم نہیں آتی“۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی اور پانی اس کے نخنوں تک آ رہا تھا۔ وہ ڈر رہی تھی اسلئے ذرا اکڑ کر باتیں کر رہی تھی۔

”اوی۔۔۔ جاؤ“ وہ شرمائے گی۔ چودھری کے ہاتھ سے چھپی کر گئی اور اس کا قد کنی اپنی لباہ ہو گیا۔ اس کے بازو پھول گئے اور بھیجے میں سربراہی رینگنے لگیں۔ بھوپل کے انبار کو ٹھنڈی ٹھنڈی سیاہ آندھی بمالے گئی اور چنگاری بھڑکی۔ دھڑک دھڑک شعلے لکھنے لگے۔ لس کی آنکھیں بھوکی چیلوں کی طرح سیاہ ابھرے ہئے تل پر جھپٹیں اور۔۔۔ اور گھن سے جیسے وہ تل ایک سیاہ چٹان بن کر اس کے ماتھے سے ٹکرایا۔ ایک دم وہ لوٹ پڑا اور پٹے ہوئے کتے کی طرح بھاگا۔ کدھر۔ اپنے کمرے میں پنگ کی طرف۔ ایک دن اس نے رتنا کو نکال دیا۔ وہ بہتر لام کھتا رہا کہ وہ لگوٹ کھکھلہ کر چھوڑ دے۔ اسے تھا مگر چودھری پر تو بھتنا سوار تھا۔ وہ ساری رات خیالات کی فوج کے ساتھ پہنچنے لڑتا رہا۔ کوئی چیز برے کی طرح اس کے جسم میں سوراخ کر رہی تھی۔ مگر سوراخ ہو ہی نہیں چلتا تھا۔ جیسے کوئی چٹان راستے میں آگئی ہو۔ آج اسے اپنی تصویر یوہ میں لکانے کیلئے رنگ مل رہے تھے۔ کھصی میں ذرا سی نیلا ہٹ ملا دینے سے بالکل وہی۔ وہی بھیگا ہوا سندھر کی تھہ جیسا گمرا اور جیتا جیتا رنگ بن گیا۔ اور آنکھوں کے لئے بھی بس سیاہی میں بلکی بزری۔ نہیں اواہٹ یا شاید سرمی رنگ اور پھر گلابی گوٹ۔ جہاں آنکھیں ختم ہوتی ہیں نا۔ اس نے چاہا آئینے میں اپنی آنکھیں دیکھئے۔ لیکن آئنہ تو جانے اس نے کب سے نہیں دیکھا تھا۔ ایک مصور کو آئنہ دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہاں آئینے میں دیکھنے کے لئے ہوتا ہی کیا ہے؟ اس کا آئنہ تو وہ ساری تصویر س تھیں جن میں چہرہ تو چہرہ اس کی روح کا کونا کونا نظر آتا تھا۔ اس کا دل و دماغ سب ہی کچھ تو رنگوں میں سما یا ہوا سامنے موجود تھا۔

پھر بھی اس نے چاہا کہ کہیں اپنی صورت دیکھے! اس نے ایک ٹین کے ڈبے کو جس میں اس کے رنگ دور دور کے شروں سے آیا کرتے تھے۔ الٹ کر جھاڑا۔ دو جھینگر پھدک کر اس کی ناک پر پٹا کھا کر اڑ گئے۔ مکڑی کا جالا اس نے کہنی سے

جھاڑ کر اپنا منہ دیکھا۔ پہلے تو اسے کچھ نظر نہ آیا جیسے سمندر کی تہ میں باریک باریک جھاڑ اور پھندے سے ہوتے ہیں یا جیسے آنکھوں میں پلکیں گھس جاتی ہیں تو پھیلا پھیلا شاد کھائی رہتا ہے، ویسا و کھائی دیا۔ پھر ایک بھیانک داڑھی اور پیاسی آنکھیں دکھائی دیں۔ اوہ، یہ وہ خود تھا۔ وہ؟ وہ، جو، مگر ایسا کبھی تھا، ہی نہیں ایسا؟ اس نے ٹین کا ڈبہ اونڈھا دیا اور بغیر آئینے کے اپنی صورت دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے داڑھی تو خیر نظر آئی اور ایک آنکھ بند کرنے سے تھوڑی سی کالے دھبے والی ناک اور پھولی ہوئی موچھے دکھائی دی۔ موچھے، اگر قینچی ہوتی تو وہ ذرا ذرا ساموچھ کو دیسا کر رہتا۔ رانی کستی تھی چتن کی موچھوں سے چھینکیں آنے لگتی ہیں۔ خون، خون، خون، وہ خود بھیناک بجانے لگا۔ یہ تو خیر معلوم تھا کہ رہتا لکوٹ بنتے تھا۔ کیا عجب کوہوتی بھی ہو۔ یا پسندے والا ہو کہ وہ آگیا مگر یہ چتن اور اس کی گزدھانی۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کمرے کی دیواریں گزدھانی کی بنی ہوئی ہوں اور وہ اسے بھینچے ڈال رہی ہوں، وہ ایک پسی ہوئی کمکھی کی طرح گزدھانی کے ایک بڑے سے ڈھیر پر چپکا ہوا مل رہا ہے۔ جب وہ شملتے شملتے تھک گیا اور تانگیں شل ہو گئیں تو اسنوں پر نک گیا پر وہ انھا کر اس نے اپنی ادھوری محنت کو دیکھنا شروع کیا۔ دیکھتے دیکھتے داغ دھبے گھومنے لگے اور ایک دم تھہر گئے۔ شانے پاش کے ہوئے چڑے کی طرح چمکنے لگے اور آنکھوں میں نیلی، کالی، ہری روشنیاں گھومنے لگیں اور تل! یہ تل کماں سے آیا۔ سانپ کی طرح گول کنٹلی مارے ابھرا ہوا تل۔ نک نک۔ نک نک۔ گھڑی کی طرح اس کا دل ٹلنے لگا۔

وہ ایکدم انھا اور اس کے پیر رانی کی کوٹھری کی طرف انھے گئے؟ گندی میلی چھوٹے سے دروازے کی گھٹھی ہوئی کوٹھری! وہ کل اسے اونچا کرائے گا۔ نہیں اونچا نہیں۔ وہ جو دوسرا کمرہ ہے، جس میں غالی ڈبے پڑے ہیں وہ ٹھیک ہے۔ وہ انڈھیرے میں بڑھنے لگا۔ اس کا دل اب بھی گھڑی کی طرح نک نک کر رہا تھا۔ کوٹھری کی سیاہی دھلی ہوئی کالونچ کی طرح اس کے چاروں طرف لیٹ گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ چارپائی سے نکرائے۔ پھر بلان کے جھوٹلے میں دھنس گئے۔ اس نے

جلدی جلدی سارا ٹنگ ٹول ڈالا، مگر رانی نہ تھی!

سارے بدن پر چھروں نے لپٹ کر چکنا شروع کر دیا۔ موئے موئے قتعے لگاتے چھر۔۔۔ اور پھر گزدھانی کی سلیں کی سلیں اس پر ٹوٹ پڑیں۔ صبح اس نے چاہا کہ رانی کی چیزیں ایسٹ کر اس سے پوچھئے کہ حرام زادی یہ رات کو کہاں ہمی تھی مگر کوئی کے گا کہ وہ راتوں کو اس کا ٹنگ کیوں ٹوٹتا ہے!

وہ چپکا کام کرتا رہا۔ اور رانی بھی آج نہ بولی۔ وہ چاہتا تھا کچھ تو بولے۔ شاید رات کے اڑنے کا پتہ چلے مگر وہ منہ بنائے روپی بیٹھی تھی۔

”کیوں کیا تھک گئی؟“ اس نے اسے ملکی رکھتے دیکھ کر نرمی سے پوچھا۔ آج وہ اس سے لڑانہ چاہتا تھا۔

”اور کیا‘ میں مٹی کی بنی ہوں؟“ وہ اپنی کمر دونوں ہاتھوں سے دبانے لگی۔ چودھری کا جی چاہا کوئی نرمی بات کے گمراہے اپنا انداز بدلتے ذرا شرمی آئی۔ ”لبس اب ستا چکی“۔ وہ سمجھتا تھا شاید وہ لڑے گی اور خیر۔ مگر رانی نے ملکی لے کر پھر جسم کو دیے ہی اکڑا لیا۔

آج رنگ تنقا اٹھے جو رنگ لگایا نہ چڑائی گا۔ آج اس نے سوچا تھا (ت) ابھی بھی بنا دے گا۔ وونہ تصویریں میں کیا تل نہیں ہوتے۔ مگر رنگوں کے مزاج بگڑے دیکھ کر وہ ٹال گیا۔ جب رانی اٹھ کر چلی تو مگر وہ رانی کا نکلا اس کی دھوتی میں سے گر کر داڑا۔ اسے خبر بھی نہ ہوئی مگر چودھری کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے سر پر سائبان (فرانز) ٹوٹ پڑا۔

”یہ گزدھانی!“ اس نے غصے سے جھاگ اڑانے شروع کئے پہلے تو وہ رکی کر اٹھا لے مگر چودھری کے تور دیکھ کر وہ چندی۔

”تم کھالو“۔ اس نے غدر سے گردن اٹھا کر کما۔

چودھری پر مرگٹ کا بھتنا سوار ہو گیا۔ وہ رانی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اور کہاں پھر ایک دم جوتے کی ایڑی سے اس نے گزدھانی لو زمین پر رکھ کر پیس ڈالا۔ دوسرے دن رانی خدا جانے کہاں غائب ہو گئی۔ اس نے دوپہر کپڑے دیتے

کی بھی تکلیف گوارہ نہ کی۔ جیسی آئی تھی ویسی ہی پھر موت آئی کچھ میں رلنے کیلئے چل پڑی۔

چودھری کی تصویر نامکمل ہی رہ گئی۔ پانچ ہزار روپے ایک سیاہ دھبے کی صورت میں اس کے دماغ پر جم گئے۔ سیاہ دھبہ جیسے نخساں ابھرا ہوا تل مگر کتنی بری جگہ تھا۔ یہ سیاہ ہوانشان! بالکل چودھری کے نجیبے میں!

اس کے بعد وہ اور بھی پریشان رہنے لگا۔ ڈر کے مارے وہ کسی سے کہتا بھی نہ تھا کہ رانی بھاگ گئی حالتے ڈر لگتا تھا کہ کیسی کوئی نہ کہے کہ آخر بھاگ گئی تو کیا یہاں ہوا۔ وہ کیوں مرا جاتا ہے۔ لذادن گزرتے گئے وہ تصویریں بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر اب کوئی چھپہ آنے میں بھی اس کی تصویریں نہ لیتا تھا، کیونکہ اس قدر بحدے، ڈر اونے، سیاہ، بھورے اور کالے رنگ شفت اور پھولوں میں بھرنے لگا تھا کہ لوگ اسے الو سمجھتے تھے۔ اس کے سارے رنگ گزندہ ہو کر خلا میں تبدیل ہو چکے تھے۔

اس کے بعد اور بھی غیر دلچسپ واقعات پیش آنے لگے لوگ رانی کے متعلق بار بار پوچھتے وہ کہہ دیتا نہ جانے کہاں گئی۔ مگر لوگ ایسے سیدھے سادھے جواب کو کب پسند کرتے تھے۔

”چودھری رانی کو بیچ آیا۔“

”ایک سو داگر آیا تھا جو کئی ہزار روپے کر لے گیا۔“

”رانی سے برا تعلق، ناجائز، کیسی پیار کرو یا۔“

”جتنے منہ اس سے دولی باسیں، چودھری کی زندگی اندھیری کوٹھری بن گئی۔“ معلوم ہوتا تھا دنیا اسے مل کر کھا جانا چاہتی ہے۔ یہی نہیں، لطف زندگی تو جب آیا جب رانی ایک خون آلود گٹھری ایک الگ سے راستے میں رکھتی ہوئی پولیس کے ہتھے چڑھ گئی۔ فوراً گاؤں پر چڑھائی ہوئی اور چودھری کے رہے سے حواس گم ہو گئے۔ رانی کے گم ہونے کا عقدہ بالکل آسانی سے کھل گیا۔ اور چودھری ہکابکا منہ پھاڑے رہ گیا۔ اف اس کی ساری عمر کی پاکبازی اور نیک نیتی یوں ناصلانی اور

اندھا دھنہ کے ہاتھوں کچلی گئی۔ مگر وہ جانتا تھا کہ خدا کو خواہ مخواہ کا اس سے بیر نہیں۔ وہ ایسے صاف نیچ جائے گا جیسے جیسے سب بے گناہ نیچ جاتے ہیں۔ سانچ کو آنج کھاں۔ مگر کاش وہ شریک جرم ہی رہتا تو پھر وہ مجرم ہی رہتا۔ یوں تو وہ مجرم تھا ہی آخر اس نے پیدا ہو کر کون سا جرم کیا تھا؟

ہاں تو کاش وہ شریک جرم ہی رہتا۔ قید بھگلتا، مصیبتیں، دکھ درد جھیلتا۔ دنیا بھر کی ذلتیں اگر اسے معلوم ہوتا تو وہ نہیں کر گود میں لپک لیتا۔ اسے معلوم ہوتا کہ وہ یوں چھوٹے گا تو وہ کوں گزگز خدا کے سامنے اپنی صفائیاں پیش کر کے دعا نہ رکھ رکھ سکتا ہاں یہ تو تھا کہ۔ ذرا تل۔ ہاں خیر! مگر خدا اکیا اپنے بندوں کی کمزوری کو نہیں جانتا۔ اس نے یہ ساری کمزوریاں انسان کے پیچھے لگا دی ہیں۔ مگر اسے کیا معلوم تھا کہ جب رانی سے باز پرس ہو گی اور سرکاری وکیل چاروں طرف سے منطق کے جال میں گھیری لے گا تو وہ یہ داؤ چلے گی۔ اور یوں آزاد۔ یا دوسرے معنوں میں برپا کر دے گی۔

”چودھری کا نہیں تھا۔ اس نے بھری بھری میں حلف انھا کر کر دیا۔

”چودھری تو یہ جرا ہے۔“ اس نے لاپڑاوی سے کہا۔ رتنا سے پوچھو یا چنتا ہے۔ اب مجھے کیا معلوم وادہ ہے اسی رانی ادا تھے انھا تی۔ ایک خاموش گرج اور چمک کے ساتھ سیاہ پہاڑ چودھری کی تستی پر پہنا اور دور سیاہی میں اور بھی گول۔ ابھرنا ہوا نقطہ پھر کنی کی طرح گھومنے لگا۔

چودھری اب بھی سڑک کے کنارے کو نکلے سے لکھری کاڑھا کرتا ہے۔ لمبی،  
تکونی، گول جیسے جلا ہوا داغ۔



## بیکار

اسی روپے تنوہ، منگائی، بجتہ، امتحانوں کی فیس ملا طلا کر گزر ہو جاتی تھی، کچھ بختا ہی نہ تھا۔۔۔ قرض ایک میئنے کا دوسرا میئنے میں پختا ہی چلا جاتا تھا۔ نیم کی پیدائش میں بھی سنتیخ تان کر پورا پڑ جاتا۔ اگر ہاجرہ کا بخار جان کونہ لگ گیا ہوتا تو جھمکیوں کو بینچنے کی نوبت نہ آتی۔ کس ارمان سے جھمکیاں بنوائی تھیں، برواد کہ ہوا خیر، پھر بن جائیں گی۔

مگر یہ سبد دل کے بہلاوے کی باتیں ہیں۔ جیز کی ساری چیزوں ایک بار ختم ہو کر پھر نہ بن سکیں۔ جگنو مددی کے امتحان کی فیس کی نذر ہو گیا۔ سوچا تھا چلو نوکری تو مستقل ہو جائے گی ہزار جگنو بن جائیں گے۔ ہر میئنے جگنو کا حساب لگتا۔ سونے کی قیمت گھٹنے کا نام ہی نہ لیتی۔ غصب خدا کا۔ ایک روپے سے ایک سو سولہ پر آگیا۔ بھلا کیا جگنو بنوائے کوئی۔

اللہ میاں نے ماں کی چھاتیوں میں دودھ بھی شاید ہا قر میاں جیسوں کی تنوہ کا اندازہ لگا کے دیا ہے۔ مکان کا کرایہ نہ ہونہ سی روکھی سوکھی چل ہی جائے گی۔ پر بچے کا وہی شاندار سامان قدرت نے اپنے ہاتھوں سے سجا دیا۔ مگر بخار میں کم بخت دودھ بھی سوکھ گیا ماں جی تو یہی کستی رہیں۔ ”بوا فیشن ہے بوتل سے دودھ پلانے کا ہمارے زمانے میں تین تین سال پلاو،“ تب بھی نہیں ختم ہوتا تھا۔“

پھر بھلا ان سے یہ کون کہتا کہ ”بوا تمہارے زمانے میں ڈالڈا نہیں تھا۔ بھر پیالے اپنے بوانی سور سے اڑاتی تھیں، پھر تین سال دودھ پلاتی تھیں تو کون سی توب چھوڑتی تھیں۔“ مگر بوا کے بغیر لگنا اپنی میت انہوں نا ہے، وہ بیچے جھاڑ کے پیچھے پڑ جاتیں کہہوں اڑ جاتے۔ کئی کئی دن بوا کے طعنے چلا کرتے۔ چلو بات ختم ہوئی۔ کھم لما، سن لیا، چھٹی ہوئی، مگر بوا کو اور کام ہی کیا تھا سوائے اپنی گٹھیا کو کوئے کے۔

گھیا کے ساتھ کوئی اور ہاتھ آ جاتا، بس اس کو دوہرائیں۔

جب تھیعت میں باقرمیاں کا نام آیا تو پسلے اسے مذاق سمجھتے رہے۔ نو برس نوکری کی، مستقل نہیں تھے تو کیا ہوا ہو جائیں گے، اپنی سرکار ہے اپنی فکر آپ کرے گی۔ خیرنوں ملا ہے تو کیا ہوا، پسلے بھی کئی بار مل چکا تھا۔ ذرا سی دوڑدھوب کے بعد پھر کسی دوسرے اسکول میں لگادیئے جاتے تھے۔ ایک دفعہ چھ میں کہیں جگہ خالی نہ تھی تو رجسٹر کے دفتر ہی میں لگ گئے تھے۔ مطلب تو تنخواہ سے تھا جب تک ملتی رہی خیال بھی نہ آیا کہ عارضی یا مستقل۔

ابا کو بیٹی کی تعلیم کا بڑا شوق تھا، زنانے پرچے مستقل اس کے نام آتے رہے، شادی کے بعد کچھ لاپرواٹی، کچھ مشغولیت اور کچھ پیے کی کمی کی وجہ سے رسائے وسائلے سب بند ہو گئے۔

جب پڑوسن نے ہاجرہ بی کو پاس کے اسکول میں عیوضی کرنے کی رائے دی تو بی اماں نے ان کی سات پشتوں کی قبر میں کیڑے ڈال دیئے۔ پڑھی لکھی عورتوں کے چال چلن کے بارے میں اتنے ڈراؤنے قصے سنائے کہ ہاجرہ نے کان پکڑ لئے کہ ”توبہ میری“ میں کہاں کر رہی ہوں نوکری“ ”یہ ساری موئی استانیاں ماشروع سے مکمل ہو دیں ہیں۔ اسکولوں کا تو بہانہ ہے، گھر میں نکو انہیں لگتا تو اسکول میں گھل کھلانے جاویں ہیں۔“ وہ کہا کرتیں۔

مگر ضرورت انسان کو تھوک جانشی پر مجبور کرتی ہے جب گھر سے نکالے جانے کی نوبت آگئی اور بہاس پڑوس کے ادھار دینے والوں نے چھ بج دروازے منہ پر مار دیئے تو ہاجرہ کو پڑوسن کی بات پر غور کرنا ہی پڑا۔

”وہ کوئی اور الوکے پٹھے ہوں گے جو بیوی کی کمائی کھاتے ہوں گے۔“ پوچھنے پر باقرمیاں نے کہا۔ ”ابھی اپنادم ہے۔ جب مر جاؤں تو جو جی میں آئے کر لیں۔“

”اب تو زیور بھی نہیں رہا، سب تار تار کر کے بک گیا۔“

معلوم ہوا کسی کے بس کی بات نہیں اور کوئی خنجریش بحالی کی نہیں رہ گئی ہے۔ نو سال مستقل نہ ہونا ہی نکتے پن کا ثبوت تھا، ویسے تو ان۔ ۔ ۔ ۔ ہاتھ اگلے

پڑے روٹیاں توڑ رہے تھے۔ مگر فرق اتنا تھا کہ انہوں نے مستقلی کی کھاتی پھاند لی تھی، انہوں نے سستی یا لاپرواہی کی وجہ سے اس کی کچھ اہمیت ہی نہ سمجھی۔  
 یہ ڈیڑھ سال کیے گزرا، یہ ہاجرہ بی جائیں یا باقر میاں، کچھ اماں جی، مگر انہیں تو گیارہ روپیہ وظیفہ ملتا تھا۔ ان کے پان تمباکو اور افسون کو پورا بڑھاتا تھا۔ کبھی کھانے کے سوا، اوپر سے پیسے کے لئے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہ ہوئی، مرنے والے نے مر کے بھی اتنا سارا تو چھوڑا۔

کیسی جھمکیاں اور کیسا گلوہ بند، ایک ایک کر کے تار تار پہلے گروہ ہوا پھر بک گیا۔ افسروں کے گھر کی خاک لے ڈالی، پر نوکری واپس نہ ملی، سال میں چھ مہینے دو ایک ٹیوشن مل جاتے۔ مگر بھری کلاس پڑھانے کے عادی شروع نہ ٹوں ایک دو بچوں کو پڑھاتے پڑھاتے بوکھلا اٹھتے۔

ہاجرہ بی نے پنجاب سے میڑک کر کے اپنے طبقے کی بیویوں میں کافی قابل اعتراض تک آزاد ہونے کا رتبہ پالیا تھا۔ جب شادی ہوئی تو سارا پڑھا لکھا بال بچوں کی دیکھ بھال میں تاک کے رختے نکل گیا۔ برسوں سے کوئی کتاب ہاتھ سے بھی نہیں چھوئی تھی۔ کبھی جی گھبرا تا تو دوپر کو پرانی "سیلی" کی جلدیں جو میکے سے ملی تھیں پھر پڑھ ڈالتیں۔ ہاجرہ بی کے "بک گیا تو کیا ہے۔ کہا تو کہ پیسہ آیا تو تمہارا سارا زیور بناؤ گا۔ مری کیوں جاتی ہو؟" اونہ، آچکا اب تو پیسہ۔ سال میں تین چار سو میں کیسے گزر ہو سکتی ہے؟"

"دیکھو جی، اگر یہ آوارگی کرنا ہے تو طلاق لے لو اور مزے کرو۔ میں دنیا کی لعنتیں نہیں سنوں گا۔" باقر میاں نے غرا کر کما اور پھر ہاجرہ کی ہمت نہ ہوئی۔ ایک تو روپے کی کی، اوپر سے سب ہی کا مزاج چڑھتا۔ اماں جی کی تو سمجھتی میں نہیں آتا تھا۔

"اے بی، ہماری تو اپنے گیارہ روپے میں گزر ہو جاوے ہے ہم پوچھیں ہیں، ولئن سے کیوں نہیں گھر چلتا۔" وہ بڑا میں حساب سننے اور سمجھنے کی نہ ان میں طاقت تھی نہ دماغ۔ کوڑی کوڑی کا حساب موجود ہے میری بی رت لگتی ہے۔

”ارے بوا“ اتنے روپے میں تو کنبے پل جاویں ہیں۔ تمہارے ہاتھ میں برکت ہی نہیں، ولہن آخر ہم کیسے گزر کریں ہیں۔“

”آپ کونہ مکان کا کرایہ دیتا پڑتا ہے نہ کھانے کا نہ بھنگی کا نہ بہشتی کا، رہ گئی افیون کی بات تو.....“

لست کا نام سن کر مختصر عقل والی اماں جی کا شھانی خون تاؤ کھا گیا۔

”ہمارا رہنا بھی کھلکھلے ہے، ہاں کرایہ لو، اس چوہے کے مل کا دو روپیاں کھاتی ہوں، حساب لگا کے لے لو اپنے پیسے، کیا سمجھا ہے ابھی دم ہے اتنا کسی کے برتن بھانڈے کر کے اتنا مل جائے گا۔ ہاتھ پیرنہ رہیں گے تو سرک پر پھکواو سبیو اللہ کے نام پر نکلوں پر رندہ اپاکٹ ہی جائے گا۔ لو اور سنو، ہم اپنے بیٹے کے گھر رہویں ہیں۔ کومال زادی کے یہاں نہیں روپیاں توڑنے جاویں ہیں۔“

لاکھ ہاجرہ بی بی نے سمجھانے کی کوشش کی ”میں نے تو حساب بتایا تھا۔ میرا خدا نہ کرے یہ مطلب تھوڑی تھا کہ آپ ہمارے اوپر بوجھ ہیں۔“ مگر وہ کہاں سننے والی تھیں۔ جو بھی ہے ان کی راگئی تو پھر رکنے کا نام نہیں، خود اپنی، اپنے خاندان کی، سات پیٹوں کو یاد کر کے ماتم کرتی رہیں۔ باقر میاں رات کو تھکے ہارے نکاسا جواب پا کر جوں ہی گھر میں گھے، اماں جی کا ریکارڈ پھر سے شروع ہو گیا۔ آدمی رات تک چلتی رہی چکلی۔ ہاجرہ نے بھی جل کر میاں کو ”نکھنو“ کہہ دیا اور باقر میاں نے حساب کتاب لگا کر ہاجرہ بی کو ”پھوڑو“ ثابت کر دیا اور اماں جی نے ان دونوں کو جو کچھ باقی رہا تھا کہ سنا یا مگر کسی کے کلمیے میں ثہنڈک نہ پڑ سکی۔  
ہاجرہ بی رات بھر روتی رہیں۔  
اماں جی کراہتی رہیں۔

اور باقر میاں ثہنڈی آہیں بھرتے رہے۔

نیچ میں نیم ڈراوے نے خواب دیکھ کر روتا رہا اور مینوں کی جو تم پیزارے کے بعد یہ طے ہوا کہ اگر ہاجرہ بی عارضی طور پر کام کرنے لگیں تو اتنا زیادہ حرج تو نہیں، جیسے ہی باقر میاں کو نوکری ملے گی، چھوڑ دیں گی۔

”ہاں جی،“ بس اب میں نے بورڈ کی مینگ میں عرضی دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں خود جاؤں گا، اسکوں کمیٹی کے دفتر دیکھتا ہوں کیا جواب دیتے ہیں۔“  
”کوئی مجھے شوق ہے منہوس نوکری کا، تمہیں نوکری مل جائے تو کروں ہی کیوں؟“ ہاجرہ بی نے اطمینان والا دیا۔

”اے بھائی، میں کون ہوں رائے دینے والی، قسم میں جو بدا ہے سو تو ہوئے گا ہی۔“ اماں جی نے بھی رضامندی ظاہر کی۔

اور ہاجرہ نے مبلغ باون روپے پر اسکوں میں بچوں کی پہلی جماعت کو پڑھانا شروع کیا۔ تجربے سے معلوم ہوا کہ اس طریقہ تعلیم میں علم سے زیادہ حمدوں اور طمانچوں کی مانگ ہے۔ صبح سے لے کر شام کے پانچ بجے تک گلا پھاڑ پھاڑ کر بچوں کو ڈالنا۔ ان کی مار پٹائی کی وھاک بھاکر امن قائم کرنا، بڑی استانی جی کو رام کرنے کے لئے سارے وقت ان کے خاندان بھر کے لئے سازہیاں، بلاوز کاڑھنا، سوپر بننا اور لحاف توشک میں ڈورے ڈالنا، ہاجرہ بی کی کڑھائی کی وہ وھاک بندی کہ ہر مریان نے اتنی سازہیاں کر ہوائیں کہ تکھوں کے آگے تارے ناچ اٹھے۔ ہاجرہ بی کو اپنے سلیقہ پر ناہ تھا۔ لنج وہ سلیقہ گلے میں پھندا بن کر پڑ گیا انکار کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ویسے روپے نہیں، اور پر کی کچھ آہنی ہو، ہی جاتی تھی اور کچھ نہیں تو وہ سر کے کھلنے کا ہی ٹھکانہ ہو جاتا تھا۔ کبھی کوئی خاتون سازھی کے شکریے میں مشھائی یا بُکٹ ہی بچوں کے لئے دے دیتیں۔“

سب ہی کو ہاجرہ بی کے گھر کا حال معلوم تھا اور کچھ نہ کچھ دیتے دلاتے ہی رہتے تھے۔ مگر ایک دن جب بڑی استانی جی نے اپے پرانے کپڑے بچوں کو دیئے تو ہاجرہ بی کو تاؤ آگیا۔ جی چاہا کہ دیں ”استانی ہوں، بھکارن نہیں ہوں۔“ پھر کچھ سوچ کر غصہ پی گئیں کیا فائدہ بھاڑ کرنے سے ذرا دو روپی کا سمارا ہوا ہے کمیں وہ بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ مگر گھر آ کر کپڑے مترا فی کو دے دیئے۔ اماں بی نے فورا نوٹ کر لیا، باقر میاں سے آتے ہی جڑا۔

”اچھے بھلے کپڑے مترا فی کو دیئے جا رہے ہیں، ار کے باپ کے گھروں ہی

لگڑ بے تھا۔ جبھی تو کہوں بیٹا، تیری کمائی میں برکت کیوں نہیں؟“

جب سے یوی کو نوکری ملی تھی باقر میاں کا عجوب حال تھا نہ اگلے بھتی تھی نہ نگلے۔ بس چلتا تو یوی کو ایک پل نوکری نہ کرنے دیتے، یا رہ دوست مذاق ہی مذاق میں چلکیاں بھرتے۔

”یار بیش ہیں تمہارے تو مزے ہیں۔ جور و کما کے لاتی ہے۔ بیٹھ کے کھاتے ہو، میاں بیکم کا ہماری وہ نخڑ ہے کہ معاذ اللہ! مل کے پانی نہیں چلتیں۔ آئے دن زیور اور کپڑے کی فرماں۔“

”یار بھی بات تو یہ ہے کہ اپن کو بھی یہ آزاد قسم کی یوی پسند نہیں۔ اماں عورتوں کا تو مصرف یہی ہے کہ مرد کا جی خوش کرے زیور کپڑے کی فرماں کرنا تو اس کا حق ہے۔ سالا وہ بھی کیا مرد جو عورت کو زیور کپڑے کو ترسائے۔“ دسرے صاحب فرماتے۔

”بھئی تمہارا جی جگرا ہے جو یوی کو تیرے میرے پاس بھیج دیتے ہو۔ یار قسم خدا کی میں تو خود کشی کر لوں پر یوں جور و کے نگزوں پر مجھ سے نہ اینڈا جائے۔“

”اڑے یہ بورڈ کے ممبر! سالے پر لے درجے کے حرامزادے ہیں۔ یہ اسکول کا نام ہے، دراصل چکلے ہیں چکلے، برانہ مانتا، تمہاری یوی تو خیر شریف ہے۔ یہ سالیاں استانیاں اول نمبر کی وہ ہوتی ہیں، یہ سب ممبروں کے گھر جاتی ہیں۔“

”لا حول ولا قوہ، اڑے یار استانیوں کو دیکھ کر قتے آتی ہے۔ سالیاں سب کالی کھتری، اجاز صورت، یہ ممبر سرے بھی گھاٹر ہوتے ہیں پورے، عشق بھی لڑاتے ہیں تو کیا تھرڈ کلاس مالے سے، یار یہ ہمارے محلے میں ایک سالی استانی ہے پیٹ بھر کے بد صورت، بکری کی سی کالی کالی ناگلیں برقعے میں سے نکلی ہوئی جب میرے گھر کے سامنے سے گزرتی ہیں میں لوندوں سے کھتا ہوں لٹادو سالی چے کتا، یار بڑا مزہ آتا ہے لگڑے کوے کی طرح پھد کتی بھاگتی تھی۔ بڑی پار سا بنتی تھی، سالی کو پیٹ رہ گیا۔ نکالی گئی محلے سے جوتے مار کے۔“

ترکش کے تیر باقر میاں کے سینے میں اترتے رہے اور وہ کھیانی سی ہس کر

بات ٹالتے رہتے۔ سنی ان سنی کر جاتے۔ جب برواشت کی طاقت شل ہو جاتی تو کسی بمانے سے انھوں کر پلے آتے۔ آتے ہی اماں جی دو چار ڈکار تھیں۔

”آج نیم کو ناٹتہ بھی نہیں دیا اور ہم صاحبہ چلتی نہیں۔ سورے سے میں کہوں اسکوں مٹ گئے ہیں کیا ہو وے ہے۔ میاں میں بڑھیا قبر میں پیر لکائے بیٹھی ہوں۔ آج مرا کل دوسرا دن۔ مگر مجھے تو تمہارے اوپر ترس آوے ہے، کیسے گزر ہو گی۔ ان بچوں پر کیا اثر پڑے گا۔ کہ اماں گھری بھر کو بھی گھر میں نہیں لکئے ہے۔“  
باقر میاں کا خون کھولتا۔

”آج آ جاوے حرامزادی۔ مزہ نہ چکھا دیا تو باپ کا نطفہ نہیں۔“  
اسکوں کے بعد بڑی استانی جی رجڑوں کی جانچ پڑتاں شروع کر دیتیں یا لا بھری کی کتابوں کا فائل لے بیٹھتیں، یا امتحان کے پرچے نقل کروانے لگتیں، ہاجره بی، کام کرتی جاتیں اور سوچتی جاتیں۔

”سلو بھوکا رہ گیا، اللہ اماں جی نے جنے ناٹتہ کرایا کہ نہیں کہیں رات کی دال نہ دے دی ہو کچھ کٹھی سی گلی تھی کہنا بھول گئی۔ پھینک دیتی تو اچھا ہوتا۔ کل دھوکی کپڑے لایا تو ملانے کی صلت ہی نہ ملی۔ آج سلو کے لئے مژکی پھلیاں لے لوں گی۔ دودھ پانی ہوتا ہے کم بخت۔ کتنا دلا پلا ہوتا جا رہا ہے میرا لال جانے انہیں تیض ملی ہو گی کہ نہیں۔ ساری تیضیں پھٹ گئی ہیں۔ اب کے تنخواہ ملے تو دو تیضوں کا کپڑا لے لوں، ہڈیاں نکل آئی ہیں۔ فکر کے مارے گھلے جاتے ہیں۔“ اور اسے اس وقت کے باقر میاں یاد آگئے۔ جب وہ نئی نئی بیاہ کر آئی تھیں۔ کپڑوں کا کتنا شوق تھا۔ بھری ہوئی تھی الماری سنوں سے انسان پر بڑھا پا آتا ہے سنا ہے یہاں گھر بارہی بوڑھا ہو گیا۔ باقر میاں تو ابھی جوان ہیں مشکل سے تمیں سال کے ہوں گے۔

”ہاجره بی..... یہ لست تو ایک سرے سے غلط ہے۔“

بڑی استانی نے چونکا دیا۔

”جی!“

”یہ دیکھو، یہ تو تیسری کلاس کے نمبر ہیں۔ یہ کہا تم نے پہلی میں ٹھونس دیئے۔ تمہارا دل بالکل نہیں لگتا چند دن سے۔ چند دن سے میں دیکھ رہی ہوں تمہاری کلاس میں بھی غل مچتا رہتا ہے۔“

”میں ابھی دوسری لست بنائے دیتی ہوں۔“ ہاجرہ بی نے گھری کی طرف دیکھ کر کما اور کاغذوں پر جھک گئیں۔

بیکاری بھی انسان کو اتنا ہی بد مزاج اور نکما بنادیتی ہے۔ جتنا ضرورت سے زیادہ بیگار۔ سارے دن کے چڑے ہوئے اور احساسِ مکتری کے کھلے ہوئے باقر میاں نے تملکہ اجرہ کو دیکھا تو ایک ایک کر کے سارے زخموں کے منہ کھل گئے۔

”کماں سے تشریف آ رہی ہے اتنی دری میں۔“

”جنم سے۔“ ہاجرہ بی نے چڑ کر کما۔

”اے بھیا، تم کون ہوتے ہو بھیا..... کماڈیوی ہیں کوئی مذاق ہے۔ پیٹ کو ٹکڑا دیتی ہیں۔ جب جی چاہے گا آؤں گی۔“ دن بھر کھیاں مارنے کے بعد اماں جی کو ذرا منہ کو ہابھی تو دینا تھی لہذا آگ پر تیل چھڑ کنا شروع کر دیا۔

”میں پوچھتا ہوں کماں کیا اتنی دری؟“ باقر میاں بہت ضبط کر کے بولے۔

”سلیم..... اے سلو.....“ ہاجرہ نے چاہا کچھ نہ سننے، کچھ نہ دیکھے۔ نہیں تو اس کے دماغ میں سے ایک پکتا ہوا شعلہ نکلے گا جو کائنات کو بھسم کر دالے گا۔

”ہم بات پوچھ رہے ہیں اور تو اڑان گھائیاں بتا رہی ہے۔ حرامزادی، الوکی چھی۔“ باقر میاں نے خوفناک انداز میں اٹھتے ہوئے سانپ کی طرح پھنکا کر کما۔

ہاجرہ بی نے باقر میاں کی نیم پاگل آنکھوں میں دیکھا اور سم گئی مگر خوف نے زبان پر اور بھی زہر گھول دیا۔

”کمائی کرنے گئی تھی اور کماں جاتی؟“

”کمائی کی بھی، یہ اتنی شام تک کمائی ہو رہی تھی۔“

”کہو تو کل سے نہیں جاؤں گی۔“ ہاجرہ بی نے چڑانے کو مسکرا کر کما۔ ”ایسا ہی میری عزت کا خیال ہے تو خود کیوں نہیں کاتے۔ یہ خوب ہے سارا دن یہاں کم

بخت بھیجا مار کے آؤ اور اوپر سے گالیاں سنو۔ پڑے پڑے اینڈتے ہو۔ عورت ہو کے میں کماوں مزے سے تھور لیتے ہو۔ اور سے غراتے ہو۔ ”ہاجرہ بی جانتی تھی وہ سب جھوٹ کہہ رہی ہے۔ باقر میاں نے کتنے دن ہو گئے تھے چٹھا رائے کر کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہ لاکھ پوچھتی ”نھیک ہے نمک؟“ وہ چونک کرتے ”ہاں، ہاں سب نھیک ہے۔“ اور پھر اپنے خیالوں کے جال میں الجھ کر ڈوب جاتے۔ مگر اس وقت اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کوئی باقر میاں کا قیمہ کر کے کتوں کو کھلا دے۔  
گالم گلوچ، جو تم پیزار، حسب پروگرام روزانہ کی طرح پینگ بڑھتے رہے اور نجیج میں اماں بی تیل کے چھینٹے اور کچھ تو نہیں۔ بس یہی۔

”کو بھلا میاں ہے کہ پاؤں کی پیراڑ، اری ہم نے تو اپنے فصم کے آگے کدی منہ نہ کھولا، ہاں بھی نکھلو میاں اور تجدید استراکسی کو نہیں بھاتا۔“  
پھر پیٹ کی پکار دم بھر کے لئے زخموں پر کھرنڈ بنادیتی۔ سرجھکا، خاموش منہ چلتے رہتے۔ دل سلگتے رہتے۔ باقر میاں کھری چارپائی پر پڑے بیڑی پھونک کرتے۔  
”اٹھئے بستر کر دوں۔“ وہ نرمی سے کہتی۔  
”رہنے دو۔“ رکھائی سے جواب ملتا۔“

”اب ان ناخنوں سے کیا فائدہ۔“ وہ کوئی نرم بات کھنا چاہتی مگر نرم باتیں تو جیسے خواب ہو گئی تھیں۔

”کہہ دیا ایک دفعہ رہنے دو۔“ باقر میاں غرائے اور ہاجرہ بی اپنی پلنگزی پر پڑ کر گئی۔ جیتی زندگی کے سماں خوابوں میں کھو جاتی جیسے وہ خواب کسی غیر کے ہوں۔  
کتنے دن ہو گئے وہ دونوں ایک دوسرے سے پیار سے نہیں بولے تھے۔  
نوکری کے بعد باقر میاں اس سے دور تر ہوتے چلے گئے ہوں ہاں کے سوا بات، ہی بند کر دی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کی اس قربانی کو سراہا جائے گا۔ ساس کے کچو کے کم ہو جائیں گے میاں کا پیار تو ملے گا۔ میاں کما کر لاتا ہے تو یوی اس کے عوض میں اپنا پیار دیتی ہے۔ اگر یوی کما کر لائے تو کیا میاں کا یہ فرض نہیں کہ وہ کم از کم اسے اپنے پیار سے تو محروم نہ کرے۔ آخر اس کا قصور کیا ہے۔ یہی تاکہ وہ سب کو

فاقوں سے بچا رہی ہے، بجائے شایاشی دینے کے محلے کی عورتیں اسے حفارت سے دیکھتی ہیں۔ جیسے وہ بازاری عورت ہو اور وہ پاک و امن گرہستون کیا وہ بھوکا مر جانے دیتی تو پارٹی بڑھ جاتی۔ محلے کے مردوں کو اس کا احسان مند ہونا چاہئے تاکہ وہ ان کی جنس کے ایک فرد کا کام انجام دے رہی ہے۔ ایک کمانے والا مرد فرعون اور کمانے والی یوں مجرم۔ خیر اسے دنیا سے نہیں باقرا میاں سے شکایت تھی۔ کتنے دن ہو گئے تھے انہوں نے اسے پیار سے کھجے سے نہیں لگایا تھا۔ ان کی محبت بھرے لمس کے لئے اس کا تھکا ماندہ جسم ترس گیا تھا۔ آج کل وہ بیکار سارا سارا دن پڑے رہتے ہیں، ایک دن وہ تھا جب وہ نوکری سے عاجز تھے کہ پیار کے لئے وقت نہیں ملتا، خود اس کا جی چاہتا تھا، ہر دن اتوار ہی رہے اور اب جبکہ زندگی ایک مسلسل اتوار بن گئی تھی، اس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ کیا وہ دن کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے؟ کیا وہ میاں کی زندگی ہی میں یہ وہ ہو گئی۔

خدا نے جیسے سن لی ایک سایہ سا اپنے اوپر جھکا ہوا محسوس ہوا۔ باقرا میاں اسے سوتا دیکھ کر مز جانے لگے۔ ترپ کر ما جرو نے ان کی آستین پکڑ لی۔ سلیم کی طرح باقرا میاں سکیاں لیتے لیتے اس کے بازوؤں میں آگئے۔ ساری غربت، ساری کثافت دو پیار کرنے والے کے آنسوؤں نے دھوڑا۔ کتنے دبليے ہو گئے تھے باقرا میاں! اس کا گلا بھر آیا، ان کے گالوں میں اتنی نوکیلی ہڈیاں تو کبھی نہ تھیں۔ ہے صدیوں کے بعد وہ ان سے ملی ہو کتنا حسین تھا یہ جسم شادی کی رات!

وہ اس کے بازوؤں میں غافل سورہ ہے تھے۔ جیسے برسوں کے جاگے ہوں۔ اب وہ اسی طرح سویا کریں گے۔ کل سے وہ اپنی کمال اتمار کر ان کے قدموں کے نیچے بچھا دے گی۔ نہ جانے کتنی مہینے سے سر میں تیل بھی تو نہیں ڈالا۔ یہ ان کے بھر بھرے ہاتھوں کو کیا ہو گیا جیسے بانس کی لمحجیاں۔ چکے چکے وہ ان کی ایک ایک انگلی کو چومتی رہی آہستہ آہستہ کہ ہمیں وہ جاگ نہ جائیں اس کا بازو سن ہو گیا۔ مگر وہ ہلی نہیں بہت دن بعد سوئے تھے باقرا میاں۔

اس نے خواب میں دیکھا۔ باقرا میاں کو نوکری مل گئی ہے وہ اسکوں جا رہے

ہیں۔ اس نے خواب میں گلوری دی تو انہوں نے اس کی انگلی میں آہستہ سے دانت گڑو دیئے۔ ساری کائنات گد گدی سے پھل پڑی اور ہاجرہ کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی اسے جھینجھوڑ کر انہارہا تھا۔

”اٹھ نصیبوں جلی، تیرا ارمان پورا ہو گیا۔“ اماں لی سرچیت کر کہ رہی تھیں۔

”ہائے دائیں، میرے لال کو کھا گئی۔“



## گھروالی

جس دن مرزا کی نئی نوکری ان لاجو گھر میں آئی تو سارے محلے میں کھلبیلی جع گئی۔ صتر جو مشکل سے دو جھاڑوں میں مار کے بھاگ لیتا تھا، اب زمین چھیلے پھینکتا تھا۔ گوا لا جو پانی میں دودھ لانے لگا۔۔۔۔۔ ایسا گاڑھا کہ ربڑی کا گمان ہوتا تھا۔

پتہ نہیں کس ارمان بھری نے لابو نام رکھا ہو گا۔ لاج اور شرم کا لاجو کی دنیا میں کوئی مصرف نہ تھا۔ نے جانے کماں اور کس کے پیٹ سے نکلی، سڑکوں پر رل کر پلی، تیرے میرے نکڑے کھا کر اس قابل ہو گئی کہ چھین جھپٹ کے پیٹ بھر سکے۔ جب سیانی ہو گئی تو اس کا جسم اس کی واحد دولت ہابت ہوا۔ جلد ہی ہم عمر آوارہ لوندوں کی صحبت میں زندگی کے اچھوتے راز جان گئی اور شتر بے مدار بن گئی۔ مول تول کی اسے قطعی عادت نہ تھی، پتھ باتھ لگ کیا تو آیا کہنے۔ نقد نہ سی ادھار سی، جو ادھار کی بھی توفیق نہ ہو تو خیرات سی۔

”کیوں ری، تجھے شرم نہیں آتی؟ لوگ اس سے پوچھتے۔

”آتی ہے۔“ وہ بے حیائی سے شرم جاتی۔

”ایک دن کھنا کھائے گی“

لاجو کو کب پرواہ تھی؟ وہ تو کھنا میثھا ایک سانس میں ڈکار جانے کی عادی تھی، صورت بلا کی معصوم پائی تھی۔ آنکھی بلا کا جل کے کالو چخ بھری۔ چھونے چھوٹے دانت، میٹھا رنگ، کیا پھکیت قسم کی درغلا۔ وہاں چال پائی تھی، دیکھنے والوں کی زبانیں رک جاتیں اور آنکھیں بکواس کرنے لگتیں۔

مرزا کنوارے تھے، باتھ سے روپیاں تھوپتے۔ بیتے او بھو گئے تھے۔ چھوٹی سی بساط خانے کی دوکان تھی، جسے وہ جنzel اسٹور کرتے تھے گھر جا کر شادی کرانے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ کبھی بیوپار ایسا مندا ہوتا کہ دیوالہ نکلنے کی نوبت آ جاتی، کبھی

ایسی ٹوٹ کے بکری ہوتی کہ سرانحانے کی بھی مملکت نہ ملتی، سر پر سرا بند ہوانے کی تو بات ہی کیا۔

بخشی کو لا جو ایک بس اشناپ پر ملی تھی۔ یہو کی پورے دنوں سے تھی، نوکرانی کی ضرورت تھی۔ جب بچہ ہو گیا تو اسے مار کے نکال دیا۔ لا جو تو پڑنے اور نکلنے کی عادی تھی مگر بخشی کو کچھ اس کی لست سی پڑ گئی تھی۔ لیکن اب اسے سندھ پار بڑے معز کے کی نوکری مل گئی تھی، اس لئے اس نے سوچا کہ لاو بھئی اسے مرزا کے ہاں ڈال آئیں۔ کنجروں میں مٹی پلید کرتے ہیں، ذرا یہ مفت کام بھی چکھ دیکھیں۔

”لا حول ولا قوہ“ میں چیخ عورتوں کو گھر میں ڈالنے کا قائل نہیں۔ ”مرزا بدک گئے۔

”ارے میاں ہٹائیے بھئی۔ سارا کام کا ج کرے گی سو گھاتے میں۔“ بخشی نے سمجھایا۔

”نہیں بھئی، یہ لعنت کمال میرے سر منڈھے جاتے ہو۔ اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتے۔“

”میرا آئیے کا نکٹ آیا ہے سارے کنبے کا نہیں آیا۔“

انتنے میں لا جو پاورچی خانے پر دھاوا بول چکی تھی۔۔۔ لفٹنگ کو لنگوٹ کی طرح کے، لمبا بانس جس کے سر پر جھاڑ بندھی تھی، لئے سارے، گھر میں گھماتی پھر رہی تھی۔ بخشی نے جب اسے مرزا کے فصلے کی اطلاع دی تو اس نے بالکل نوش نہیں لیا۔ اس سے پتیلیاں مچان پر جمانے کو کہا اور خود غل پر پانی لینے چلی۔

”اگر تو کہے تو واپس گھر پہنچا دوں۔“

”چل دوڑ ہو! تو میرا خصم ہے جو میکے چھوڑ آئے گا! جا اپنا راستہ لے۔ ہم میاں سے نہ لیوں گے۔“

بخشی نے موٹی موٹی گالیاں دیں کہ حرافہ اکڑتی کا ہے پہ ہے۔ لا جو نے اس سے بھی ٹھکری گالیاں دیں کہ بخشی جیسے لفٹنگ کو بھی پیمنہ چھوٹ گیا۔۔۔

بخشی کے جانے کے بعد رزا کی ایسی شی گم ہوئی کہ وہ نوک دم بھاگ گئے۔

مسجد میں بیٹھے دیر تک سوچتے رہے۔۔۔ بے کار کا خرچ بڑھے گا۔ چوری الگ کرے گی۔ کیا بلا سر آپڑی۔ مغرب کی نماز کے بعد گھر لوٹے تو دم بخود رہ گئے۔۔۔ جیسے بی اماں مرحومہ واپس تشریف لے آئی ہوں۔ گھر چندن ہو رہا تھا۔ پانی پینے کا کورا منکا جس پر مجھا ہوا کثورا جھلما رہا تھا، لا لشین صاف جملگاتی۔

”میاں کھانا اتاروں؟“ لاجونے گھات گھات کا پانی پیا تھا۔۔۔

”کھانا؟“

”تیار ہے گرم گرم روٹی ڈالتی ہوں۔ ابھی۔ آپ بیٹھئے۔“ بغیر جواب نے وہ رسولی میں چل گئی۔

آل پاک کی ترکاری، دھلی موگ کی دال، زیرہ اور پیاز سے بھماری ہوئی۔ بس اماں جی کے ہاتھ سے کھائی تھی۔ گھلے میں نوالا اٹکنے لگا۔

”پیسے کھاں سے لائی؟“ انہوں نے پوچھا۔

”بنے سے سامان ادھار لے آئی۔“

”میں تمہاری واپسی کا کرایہ دے دوں گا۔“

”واپسی؟“

”ہاں میری..... حیثیت نہیں۔“

”کون مانگے ہے تنخواہ؟“

”مگر.....“

”زیادہ مرچیں تو نہیں۔“ لاجونے پھلکا رکابی میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔۔۔

کویا بات ختم۔

جی چاہا کہہ دیں، نیک بخت سر سے پیر تک مرچیں ہی مرچیں لگی ہوئی ہیں۔ مگر لاجوچ پا جھپٹ تازے پھلکے لانے میں لگی ہوئی تھی۔ جیسے رسولی میں کوئی بیٹھا پکا کے دے رہا ہو۔

”خیر صبح دیکھا جائے گا۔“ مرزا یہ سوچ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ عمر میں پہلی دفعہ ایک جوان عورت گھر میں سورہ تھی، نہ جانے کیا لگ رہا تھا۔ تھکے

ہوئے تھے سو گئے۔

”نامیاں میں نہ جانے کی۔“ صبح کو جب انہوں نے اس کے جانے کی بات چھیڑی تو لا جو نے انہی میٹم دے دیا۔  
”مگر.....“

”کیا میرے ہاتھ کا کھانا پسند نہ آیا؟“

”یہ بات نہیں۔“

”گھر کی جھاڑو بھاڑو ناکی؟“

”وہ تو سب نہیں ہے مگر.....“

”تو پھر کون سی کتھا ہوئی؟“ لا جو گرم ہو گئی۔

پہلی ہی نظر میں لا جو دل دے بیٹھی تھی مرزا کو نہیں گھر کو! بغیر مالکن کا گھر اپنا ہی ہوا تھا۔ گھر مرد کا تھوڑا ہی ہوتا ہے، وہ تو مہمان ہوتا ہے۔ بخشی مو ا تو کیزوں بھرا کباب تھا۔ الگ کو نھا کر کے رکھا تھا اور کو نھا بھی کم بخت نندی کمار کی بھینس کا غیلیلہ بھیں تو کبھی کی خدا کو پیاری ہو چکی تھی مگر ایسی بو چھوڑ گئی تھی کہ لا جو کی رگ رگ میں رچ گئی تھی اور اپر سے نخرے کرتا تھا سو الگ۔۔۔۔۔۔ یہاں گھر کی رانی تو وہی تھی۔

مرزا نے بھوندو تھے، یہ لا جو نے دیکھتے ہی تاز لیا تھا۔ واقعی مہمانوں کی طرح آتے، چپ چاپ جو آگے رکھ دیتی کھایتے۔۔۔۔۔ چلتے وقت پیسے دے جاتے۔ دو چار مرتبہ حساب پوچھا، پھر اطمینان ہو گیا کہ لوٹی نہیں صبح کے گئے شام کو آتے۔

لا جو دن بھر گھر کو سنوارتی، آنگن میں نہاتی، کبھی جی چاہتا تو پڑوس میں رامو کی دادی کے پاس جا بیٹھتی۔ رامو مرزا کے سور میں کام کرتا تھا۔ لا جو پر فوراً نرم ہو گیا، تیرہ چودہ برس کا ہو گا۔ مونہ پر دھڑلوں مہا سے، بری صحبت میں مٹی ہو گیا تھا۔ اسی نے بتایا کہ مرزا اکثر کنجرا کے ہاں جاتے ہیں۔

لا جو کو بہت برا لگا۔۔۔۔۔ بے کار کا خرچہ۔ ذاکریں ہوتی ہیں یہ کنجراں! آخر

وہ خود کس مرض کی دوا تھی؟ آج تک جماں رہی، سب ہی خدمات خوش اسلوبی سے سنبھالیں۔ لا جو کو آئے ہفتہ گزر گیا۔ ایسی بے قدری اس کی کمیں نہیں ہوئی۔ مردوں عورت کے رشتہ کو اس نے ہمیشہ فراخ دل سے دیکھا۔ پیار ہی اس کے لئے سب سے حسین تجربہ تھا۔ کچھ عمر سے اسے اس پیار سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ نہ مان ملی، نہ دادی، نانی جو اونچی بچ سمجھاتیں۔ اس معاملے میں لا جو تو بالکل پڑوس کی ملی تھی، جو بلوں کے التفات کو اپنا حق سمجھتی تھی۔

ادھر ادھر سے بہت پیغامات اسے مل رہے تھے مگر وہ مرزا کی نوکرانی تھی۔  
اس نے اوروں کو ٹال دیا کہ لوگ نہیں گے مرزا پر!

مرزا اور پر سے برف کا تودہ بننے بیٹھے تھے، انہر بے چاروں کے جواہاں کمھی دیکھ رہا تھا۔ جان بوجھ کر گھر سے کئے کئے سے رہتے عجیب دل کا عالم تھا۔ کچھ محلے کے من چلوں کا بھی ان کی وحشت میں ہاتھ تھا۔۔۔۔۔ جدھر دیکھو لا جو کا چرچا، آج اس نے دودھ والے کا موئہ کھوٹا، کل پنوایی کے تھوڑے پر گوبرا اخا کردے مارا۔ جدھر جاتی لوگ ہتھیلی پر دل لے کر دوڑے پڑتے تھے۔ اسکوں کے ماں سر جی گلی میں مل جاتے تو اسے شکشادینے پر مصروف ہوتے۔ مسجد سے نکلتے ہوئے ملا جی بھی اس کے کڑوں کی آواز سن کر آئینہ الکری پڑھنے لگتے۔ مرزا کچھ چھڑے ہوئے سے گھر میں گھے۔ لا جو اسی دم نہا کر انھی تھی۔ گیلے بال شانوں پر پڑے تھے۔ چولھا پھونکنے کی وجہ سے گال تمتما رہے تھے آنکھیں چھلک رہی تھیں۔۔۔۔۔ میاں کو بے وقت آتا دیکھ کر دانت نکوس دیئے۔ مرزا ہڑپدا کر گرنے سے بچے۔

سر جھکا کر روٹی کھائی۔ پھر چھڑی انھا کر مسجد میں جا بیٹھے۔ مگر دل گھر میں پڑا تھا۔ پتہ نہیں بیٹھئے بھائے گھر کیوں ایک دم یاد آنے لگا تھا۔ لوٹ تو لا جو دروازے پر کھڑی کسی سے جھگڑ رہی تھی۔ مرزا کو دیکھ کر وہ شک گیا۔

”کون تھا؟“ انہوں نے شکی شوہر کی طرح پوچھا۔

”رگھوا۔“

”رگھوا؟“ برسوں سے دودھ لیتے تھے مگر گوالے کا نام بھی نہیں معلوم تھا۔

”دودھ والا۔ حقہ تازہ کروں میاں؟“ لاجوٹانے لگی۔

”نمیں۔ کیا کہتا تھا؟“

”پوچھتا تھا، کتا دودھ لاؤں؟“

”پھر تم نے کیا کہا؟“

”میں نے کہا تیری ارتھی اٹھئے، جتاروز لاتا ہے۔“

”پھر؟ مرزا کا جی سلگنے لگا۔

”پھر میں نے کہا، حرامی اپنی اماں بھینا کو دودھ پلا۔“

”الو کا پنھا، بڑا حرامی ہے یہ رگھوا۔ بند کمر دو دودھ۔ ہم اشور سے والپسی پر لے آئیں گے۔“

رات کا کھانا کھانے کے بعد مرزا نے بڑے ٹھٹے کے ساتھ کلف دار کرتا پہنا، عطر کی پھریری کان میں انکائی اور چھڑی سنجبل کر کھنکارتے ہوئے چل دیئے۔ لاجو جل بھن کر کباب ہو گئی۔ پتی درتا کی طرح گم صم دیکھتی رہی اور من ہی میں اس کنجرا کو کوتی رہی۔ وہ مرزا کو پسند نہیں، ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔

کنجرا اپنے دوسرے گاہک کو نمثا رہی تھی۔ مرزا بگڑ کے لالہ کی دکان پر جا بیٹھئے۔ مدنگائی اور سیاسی الٹ پھیر پر جی جلا کے والپس جسم بھلائے ہوئے لوٹے تو گیارہ نجح چکے تھے۔ پانی کی صراحی سرمانے رکھی ہوئی تھی مگر دھیان نہ گیا۔ باورچی خانے والے ایک درے میں مٹکا رکھا تھا۔ غث غثا کر نہنڈا پانی پیا، مگر جی کی آگ اور بھڑک انٹھی۔

لاجو کی چکنی سنہری ٹانگ دروازے کی آڑ سے جھانک رہی تھی۔ بے ذہنگی سی کروٹ پر اس کے کڑے کمنائے اور ٹانگ اور پس رگئی۔ مرزا نے ایک گلاس اور چڑھایا اور لاحول کا اور د کرتے ہوئے پنگ پر گر پڑے۔

کروٹیں لے لے کر جسم چھل گیا، پانی پی پی کر پیٹ تھارہ ہو گیا۔ دروازے کے پیچھے سے ٹانگ کچھ اور بھی ازٹنگے لگانے لگی۔ ان جانے خوف گلا دبو پنے لگے۔ بڑا وند مچائے گی نامراد! مگر شیطان نے پیچھے سے دھکیلنا شروع کیا۔ اپنے پنگ سے

اک درے تک نہ جانے کتنے میں کے چکر کاٹ پکے تھے۔ اب ان میں دم نہیں تھا۔

پھر ایک نہایت بھولا بھالا سا خیال ان کے دل میں سراٹھا نے لگا۔ اگر لا جو کی مانگ اتنی کھلی نہ رہے تو انہیں اتنی پیاس نہ لگے۔ اس خیال نے جیسے ہی پھن انھیا، ان کی ہمت بڑھ گئی۔ نامرا جاگ گئی تو نہ جانے کیا سمجھے گی۔ مگر اپنے بچاؤ کی خاطر خطرہ بھی تو مول لیتا پڑتا ہے۔

جوتے پٹی تلے چھوڑے اور دبے پاؤں وہ سانس روکے آگے بڑھے۔ چنکی سے لہنگے کی گوٹ پکڑ کر کھینچ دی۔ دوسرے لمحے انہیں پچھتاوا بھی ہونے لگا۔ شاید غریب کو گرمی لگ رہی ہو۔ تھوڑی دیر غیر فیصلہ کن انداز میں کھڑے کانپتے رہے۔ پھر دل پر پھر رکھ کر واپس مڑے۔

ابھی ان کے تھنکتے قدم چوکھت تک نہ پہنچے تھے کہ قیامت نوٹ پڑی۔ ایک لوٹ لگا کر لا جونے انہیں جا لیا۔ مرزا کی گمگھی بندھ گئی۔ مرزا کے ساتھ زندگی میں اسی بے جا بھی نہ ہوئی تھی وہ ہائی ہائی کرتے رہ گئے اور لا جونے ان کی لاج لوٹ لی۔

صحیح کو مرزا لا جو سے ایسے شمارہ ہے تھے جیسے نئی بیاہی دلس، لا جو سینہ زور فال تھی کی طرح سمجھی گنگنا رہی تھی اور پرانھوں میں گھمی کی تیسیں جما رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں رات کی بات کا کوئی غمگھا نہ تھا۔ دیے ہی روزانہ کی طرح دہنیز پر بیٹھی کھیاں اڑاتی رہی۔ مرزا ذر رہے تھے کہ اب وہ انگلی پکڑتے پا کچے پکڑے گی۔

دوپہر کو جب وہ ان کے لئے کھانا لے کر دکان پر آئی تو اس کی چال میں عجیب سانحہ کا تھا۔ لا جو کو دیکھ کر لوگ خواہ خواہ بھی چیزوں کا بھاؤ پوچھنے آ جایا کرتے تھے۔ مارے باندھے کچھ خریدنا بھی پڑ جاتا۔ بغیر کہے لا جو فوراً سامان تول ناپ کر دینے لگتی۔ ہر چیز کے ساتھ ذہروں مسکراہیں اور خرے بھی باندھ دیتی۔ اتنی سی دیر یہیں وہ اتنی بکری کر جاتی کہ مرزا سے صحیح سے شام تک نہ ہو پاتی۔ آج یہ بات انہیں بڑی ناگوار گزر رہی تھی۔

مگر اب تو جو مرزا کے سوراہ کے نہیں۔ کیا بولی چڑھ گئی اور رنگ نکل آیا۔ لوگ وجہ جانتے تھے اور جلنے مرتے تھے۔ مرزا کی بھی دن بدن بوکھلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ جتنی وہ ان کی خدمت گزاری کرتی گئی یہ اس کے دیوانے ہوتے گئے اور ان کے دل میں دنیا کا خوف بڑھتا گیا۔ انہیں لا جو کی بے سکلفیوں کامہ ہوش کن تحریر تھا۔ پر لے درجے کی بے حیا تھی۔ کھانا لاتی تو بازار میں بھونچال آ جاتا۔ کسی کی چنکی بجھتی، کسی کو لمبھینگا دکھاتی، تحرکتی، کوئے منکاتی، گالیاں جھاڑتی ہوئی آتی تو مرزا کا خون کھول اٹھتا۔

”تم کھانا لے کر نہ آیا کرو۔“

”کاہے کو؟“ لا جو کا موئہ اتر گیا۔ سارے دن اکیلی بیٹھی بولا جاتی ہوں۔ بازار میں ذرا رنگ جمتا تھا۔ نہیں دل لگتی چلتی تھی۔

جب وہ کھانا لے کر نہیں آئی تو مرزا کے دل میں طرح طرح کے شبه اٹھنے لگے۔ نہ جانے کیا گل کھلا رہی ہو گی مردار! وہ وقت بے وقت جاسوی کرنے آ دھمکتے۔ وہ فوراً ان کی تحکمن اتارنے پر مصر ہو جاتی ایسی عصیتیت لونڈیا سے خوف نہ آئے گا۔

ایک دن جو یوں ایک دم گھر پہنچے تو دیکھا لا جو ردی کانڈ والے کو بے نقطہ نہ رہی ہے، اور ردی والا دانت نکو سے ثربت کے سے گھونٹ گلک رہا ہے۔ مرزا کو دیکھا تو بھاگا۔ مرزا نے لپک کر گردن ناپی۔ کس کے دو جھانپڑ لگائے اور دی ایک لات!

”کیا قصہ تھا؟“ مرزا کے نہنے پھولنے لگے۔

”موت پڑا دس آنے سیر کے دے رہا تھا۔ میں نے کہا اپنی اماں کو دے جا کے حرام زادے۔“ ردی کا کھلا بھاؤ آئٹھ آنے سیر تھا۔

”تم سے کس نے کہا ہے ردی بیچنے کو۔“ مرزا بزبردائے اور پیر کھینچ کر نہ ہو لئے لگے۔

مگر اس دن تو ان کے جلال کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے لا جو کو گلی کے

لوگوں کے ساتھ کبڈی کھلتے دیکھا۔ اس کا لئنگا بوا میں قلانچیں مار رہا تھا۔ پچھے تو کبڈی کھل رہے تھے، بچوں کے باپ لئنگے کی فیاضی سے لطف انداز ہو رہے تھے۔ یہ سب ہی باری باری اسے کوئا دلانے کی پیش کش کر چکے تھے، جو لا جونے نہ کر سکتا تھا۔ میاں جی کافر تو دیکھو جیسے وہ ان کی بیاہتا ہی تو ہے۔

لا جو ان کی جان کو روگ کی طرح چمٹ گئی تھی۔ اس کی جدائی کے خیال سے ہی پسندے چھوٹے لگتے تھے۔ اسشور میں ان کا بالکل جی نہ لگتا، سارے وقت لا جو کا خیال ستاتا۔ نہ جانے کب کسی بھاری پیش کش پر نامراد کی راں نپک پڑے۔

”میاں نکاح کیوں نا پڑھوا لیتے۔“ انہوں نے میرن میاں سے دکھڑا روپا تو انہوں نے رائے دی۔

”لا حول ولا قوہ! نکاح جیسی مقدس رسم کو اس تجھے سے کیسے دابستہ کیا جا سکتا ہے؟ زمانے بھر میں لئنگا اچھال کر اب وہ ان کی دلمن کیسے بن سکتی ہے؟ مگر شام کو جب واپسی پر لا جو غائب ملی تو ان کے پیروں تملے سے زمین کھک گئی۔ لالہ کم بخت بہت دنوں سے سونگھے رہا تھا۔ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی، اس نے پکار کر سب کے سامنے کما تھا کہ کوئا نہیں، وہ کے تو بندگہ لے دوں گا۔ میرن میاں بڑے دوست بنتے تھے۔ ان پچکے سے انہوں نے بھی حسب حیثیت نذرانہ پیش کیا تھا۔

مرزا بوکھلائے ہوئے میٹھے تھے کہ لا جو واپس آگئی۔ وہ راموں کی دادی کی پیٹھے ملنے گئی تھی۔

اس دن مرزا نے فیصلہ کر لیا کہ خاندان کی ناک کئے یا سلامت رہے، لا جو کو نکاح میں لانا پڑے گا۔

”کاہوئے کو میاں؟“ جب مرزا نے اپنی تجویز پیش کی تو لا جو بوکھلا گئی۔

”کیوں؟ کیا کمیں اور دیدے لانا کا ارادہ ہے؟“ مرزا بگزگئے۔

”تحو! میں کاہے کو لڑاؤں دیدے!“

”وہ راوی جی بنگھے دلانے کو کہتا ہے۔“

”میں تھوکوں بھی نا اس کے بنگلے پر، جوتی مار دی میں نے اس کے تھوڑے پر۔“

”تو پھر؟“

مگر لا جونہ سمجھا سکی کہ بیاہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو جنم سے ان کی ہے اور ان کی ہی رہے گی، پھر ایسی کون سی خطا ہوئی جو میاں کو نکاح کی ضرورت محسوس ہوئی؟ پر ایسا مالک تو نہ جانے کتنے جنم بھوگنے پر ملتا ہے۔ لا جونے بڑی نھوکریں کھائی تھیں۔ مرزا اسے فرشتہ معلوم ہوتے تھے۔ اس کے سب مالک اس کے عاشق بن جاتے تھے، پھر اسے چار چوت کی مار دیا کرتے تھے۔ مرزا نے کبھی اسے پھول کی چھڑی بھی نہ چھووائی، اور پیار بھی جی بھر کے کیا۔ دو جوڑے بنوائے اور سونے کی مندریاں دلا دیں۔ پچ سونے کا زیور تو اس کی سات پیڑھی نے نہ پہنا ہو گا۔——

انہوں نے راموکی دادی سے کہا۔ وہ بھی حیرت میں پڑ گئی۔

”اے میاں کا ہے کو گلے میں چھٹی باندھو۔ کیا سری نخرے کرنے لگی ہے؟ تو مار دیو چزیل کو، نہیک ہو جائے گی۔“ جہاں جوتے کاری سے کام چل جائے وہاں نکاح کی کہاں گنجائش ہے۔

مگر مرزا کو تو ایک رث لگی تھی ”اگر میری ہے تو میرے نکاح میں آ جا۔——“

”کیوں رہی؟ کیا تجھے دھرم کی اوٹ لگے ہے؟“

”نامیا ایسی بات نہ۔ میں تو انہیں اپنا پتی مانتی ہوں۔“ لا جو بڑی میٹھی طبیعت کی تھی، وہ تو دو گھنٹی کے مالک کو بھی دم بھر کے لئے پتی مان کے اس کی سیوا کرتی تھی۔ اس نے کبھی اپنے کسی عاشق کے ساتھ کنخوں نہیں بر تی۔ دھن نصیب نہ ہوا۔ تن اور من اس نے سینت کے نہ رکھا جسے دیا جی بھر کے دیا، جی بھر کے لیا، اور مرزا کی تو بات ہی نرالی تھی انہیں دینے اور ان سے چھیننے میں جو مزہ آتا تھا وہ کوئی لا جو کے دل سے پوچھتا۔ ان کے سامنے سب ڈھیٹ کتے معلوم ہوتے تھے۔ وہ

اپنی حقیقت جانتی تھی۔ شادی بیاہ تو کنواریوں کے ہوتے ہیں اور اپنے ہوش میں وہ سمجھی کنواری نہ تھی۔ وہ کسی کی دلمن بننے کے لائق نہیں۔

وہ بہت ہاتھ پاؤں جوڑ کر گزگزائی، مگر مرزا پر نکاح کا بھوت سوار تھا۔ نیک ساعت دیکھ کر ایک دن عشاء کی نماز کے بعد نکاح ہو کیا۔ تمام محلے نولے میں اودھ مج گیا۔ لوئڈیاں بالیاں ڈھول لے کر سماں گانے لگیں، کوئی دلمن والی بن گئی، کوئی دولما والی۔ اور مرزا نے ہنس بنس کے نیگ دیا۔ اور لا جو عرف کنیز فاطمہ مرزا عرفان علی بیگ کے نکاح میں آگئیں۔

نکاح میں التے ہی مرزا نے لہنگوں پر پابندی لگادی اور تنگ موری کا پاجامہ کرتا بنوا دیا۔ کنیز فاطمہ کو ٹانگوں کے بیچ میں خلاء کی عادت تھی۔ دو الگ الگ پاٹھنے پس میں دو ٹانگوں کے بیچ میں کپڑا آجائے زرا جھنجھٹ ہے۔ وہ بار بار اس فضول رکاوٹ کو کھینچے جاتی۔ پہلی فرصت میں اس نے پاجامہ اتارا لگنی پر ڈالا اور لہنگا کا انھا کر سر سے پسن، ہی رہی تھی کہ مرزا آگئے۔

اس نے لہنگا کر پر روکتے کی بجائے چھوڑ دیا۔

”لا حول ولا قوہ!“ مرزا اگر بننے لگے اور چادر کھینچ کر اس پر ڈال دی۔ نہ جانے مرزا نے کیا بھاشن جھاڑا، اس کے کچھ پلے نہ پڑا کہ اس نے کیا غلطی کی؟ اس کی اس حرکت پر تو مرزا کی جان جایا کرتی تھی مرزا نے اچھا بھلا لہنگا بچ مج انھا کر چو لئے میں پھینک دیا۔

مرزا بھن بھن کرتے چلے گئے۔ وہ چور سی بیٹھی رہ گئی۔ چادر پھینک کر اس نے اپنے جسم کا معاشرہ کیا کہ کہیں کوڑھ تو نہیں پھوٹ آیا، غل کے بیچ نہاتے وقت وہ بار بار آنسو پوچھتی رہی۔ سر کے والے کا لوئڈا مشھوٹنگ اڑانے کے بہانے پاس کی چھٹ پر سے اسے نہاتے دیکھا کرتا تھا۔ آج وہ ایسی اداس تھی کہ نہ اسے انگو نھا دکھایا نہ جوتی سے دھمکایا، نہ بھاگتی ہوئی کوئی کوئی میں گئی، بلکہ چادر بیٹھ لی۔

دل پر پھر رکھ کر اس نے شیطان کی آنت جیسی لمبی موریاں چڑھائیں مرے پر سو درے۔ اوپر سے کمر بند سنک گیا۔ چلا چلا کر گلا بینٹھ گیا تب جلو آئی اور کمر بند

پڑا۔ یہ بندوق کا خلاف کس بندوق نے ایجاد کیا ہو گا۔ حتیٰ بارٹی جاؤ، کھولو، باندھو! جب مرزا دکان سے لوٹے تو پھر کمر بند تک گیا تھا۔ وہ انگلی سے پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مرزا کو اس پر پیار آگیا۔ چکار کر گود میں سمیت لیا۔ بڑی گلزاری سے کمر بند ہاتھ آیا، تب اسے پاجامے سے اتنی ڈکایت نہ رہی۔

پھر ایک مصیبت اور کھڑی ہو گئی پسلے جو لا جو کی رعنائیاں تھیں وہ مرزا کی دلمن میں بے حیائیاں بن گئیں۔ یہ بازار و عورتوں کے لئے شریف زادیوں پر زیب نہیں دیتے۔ وہ ان کے خوابوں کی روایتی دلمن نہ بن پائی کہ مرزا پیار کی بھیک مانگیں یہ شرمائے، وہ ضد کریں یہ گزر جائے، وہ منا میں یہ روٹھ جائے۔۔۔ لا جو تو سرک کا پھر تھی، سیجنوں کا پھول بننے کے گر نہیں جانتی تھی۔ ڈانٹ ڈانٹ کے مرزا نے لگائیں لگائیں آخر بند ریا کو سدھا ہی لیا۔

مرزا اب نہایت مطمئن تھے کہ انہوں نے لا جو کو شریف زادی بنا کر ہی چھوڑا۔ یہ اور بات ہے کہ اب انہیں گھر بھاگنے کی زیادہ جلدی نہیں ہوتی۔ عام شوہروں کی طرح یار دوستوں میں بھی اٹھ بینہ لیتے کہ لوگ جور کا غلام نہ کہیں۔ معشوق کے ناز اخھانا اور بات ہے مگر بیوی کی جوتیاں۔ برداشت نہیں کر سکتا۔

ایسی غیر حاضریوں کی تلاش کرنے کے لئے انہوں نے ایک مارکھنے کی تجویز پیش کی۔ مگر لا جو کی آنکھوں میں خون اتر آیا، وہ جانتی تھی، کہ میاں کنجھی کے ہاں جانے لگے ہیں۔ سارے محلے کے میاں لوگ جاتے تھے مگر گھر میں وہ کسی کا عمل دخل برداشت نہیں کر سکتی۔ کوئی اس کے پیغمبگھاتے برتوں کو ہاتھ لگائے، اس کی رسولی میں قدم رکھے تو اس کی نانگیں چیر کر پھینک دے گی۔ وہ مرزا میں سا جھا برداشت کر سکتی تھی، مگر گھر کی وہی اکیلی ماں لکن تھی۔

پھر مرزا جی جیسے لا جو کو گھر میں رکھ کر بھول گئے۔ ہفتوں ہوں ہاں سے آگے بات نہ ہوتی۔ جب تک وہ واشٹہ تھی، سب آنکھیں سینکتے تھے۔ جب کسی شریف کے گھر بینہ گئی تو محلے نوں کے اصولوں کے تحت ماں، بسن اور بیٹی ہو گئی۔ کوئی بھول کر بھی لاث کے پردے کے پیچے نگاہ ڈالنے کی رخصت نہ کرتا۔۔۔ سوا مشحو

سرکی والے کے لونڈے کے۔ وہ اب بھی وفا بھا رہا تھا۔ وہ اب بھی کوئی پر پنگ اڑاتا۔ جب مرزا چلے جاتے اور لا جو کام کانج سے فارغ ہو کر غل کے یئچے نمانے بیٹھتی پر دے کے خیال سے ہی تو غل لگوایا تھا۔ لا جو نے کوئی کی طرف دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ مگر اس رات مرزا یار دوستوں کے ساتھ دسرے کا جشن منانے غائب رہے تھے۔ صحیح چینپتے ہوئے لوٹے اور جلدی جلدی نساد ہو کر اسٹور چلے گئے۔ لا جو جنہی بیٹھی تھی تب ہی اس کی نظر کوئی کی طرف انھی گئی یا شاید اس دن مٹھوا کی نظروں میں بھالے لگے ہوئے تھے جو اس کے گیلے جسم میں پوسٹ ہو گئے۔ اور لونڈے کی بہت دن بعد اس دن پنگ کٹ گئی، ذور نوٹ تو لا جو کی بیٹھی پر گھسا مارتی چلی گئی۔

لا جو نے سکاری بھری اور قصداً "یا سوا" چادر بغیر انھوں تر کو خری میں لپ گئی۔ ایک بھلی سی کونڈی اور سامنے کوئی پر گری پھرا سے خیال آیا کہ غل تو کھلا ہی چھوڑ آئی تھی، لہذا اپس اتنے پاؤں بھاگی۔

اس کے بعد جب کبھی لا جو طوائی کے یہاں سے کچھ منگوانے کو ثاث کا پرہ سر کاتی تو مٹھوا آس پاس ہی منڈلاتا نظر آتا۔

"اے مٹھوے، کیا دن بھر گوبر کا ساچوتھہ بنا بیٹھا رہے ہے جا زرادو کچوریاں تو لادے۔ چمنی میں خوب ساری مرچیں ڈلوائیو۔"

پھر مٹھوا اور بھی بل گیا، اگر غلطی سے نہاتے وقت کوئی پر نظر آتا تو وہ زور زور سے بالی کھڑکاتی کہ اگر قبر میں سوتا ہوا ہوتا تو پھر پھر اس کے جاگ انھتا۔ جو پیار وہ ساری عمر دونوں دونوں ہاتھوں سے لٹاتی آئی تھی، مٹھوا کے لئے بھی حاضر تھا۔ مرزا اگر کسی وقت کا کھانا نہ کھاتے وہ پھینک تھوڑا ہی دیتی تھی، کسی غریب حاجت مند کو کھلا دیتی تھی۔ اور مٹھوا سے زیادہ اس کی عنایات کا کون حاجت مند تھا۔

مرزا نے لا جو کے پیر میں بیاہ کی زنجیریں ڈال کے سوچ لیا کہ اب ہو گئی وہ گرہستن۔ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتے تو یقین بھی نہ کرتے۔ لا جو نے جو انہیں یوں

بے وقت چوکھٹ پ کھڑے دیکھا تو بے اختیار نہیں نکل گئی۔ اس نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ مرزا اس شدت سے برآ مانیں گے۔ مگر مشھوا تاز گیا اور دھوتی انھا کے ایسا بھاگا کہ تمن گاؤں پار کر کے ہی دم لیا۔

مرزا نے لا جو کو اتنا مارا کہ اگر وہ دنیا کے سرد و گرم نہ جھیلے ہوتی تو اللہ کو پیاری ہو جاتی۔ اسی دم یہ خبر سارے گاؤں میں آگ کی طرح پھیل گئی کہ مرزا نے اپنی گھروالی کو مشھوا کے ساتھ پکڑ لیا اور دونوں کو جنم و اصل کر دیا۔ مرزا کا مومنہ کالا ہو گیا۔ خاندان کی ناک کٹ گئی۔ لوگ جو ق در جو ق تماشا دیکھنے جمع ہوئے، مگر یہ دیکھ کر انہیں سخت نامیدی ہوئی کہ مشھوا تڑی ہو گیا اور رگھروالی نوٹ پھوٹ گئی، مگر جی جائے گی۔ رامو کی دادی اسے سمیٹ لے گی۔

کوئی سوچے گا کہ اتنے جوتے کھانے کے بعد لا جو کو مرزا کی صورت سے نفرت ہو گئی ہوگی۔ توبہ کیجئے۔ جو تاکاری سے تو اصل بندھن بندھا جو نکاح سے بھی نہ بندھا تھا۔ ہوش میں آتے ہی مرزا کی خیریت پوچھنے لگی۔ اس کے سب ہی آقا دیر سوری اس کے عاشق بن بیٹھتے تھے۔ اس عنایت کے بعد تنخواہ کا سوال ختم ہو جاتا۔ مفت کی رگڑائی، اوپر سے چارچوٹ کی مار۔ مرزا نے آج تک اسے پھول کی چھڑی نہ چھوٹائی تھی۔ دوسرے آقا اسے یار دوستوں کو مستعار دے دیتے تھے۔ مرزا نے اسے اپنی چیز سمجھا، اس پر اپنا حق جانا۔ یہ اس کی عزت افزائی تھی۔ حالانکہ استعمال میں نہ تھی پھر بھی انہیں اتنی پیاری تھی۔ درد پر مرزا کی ٹیکیں غالب آگئیں۔ سب نے اسے سمجھایا کہ جان کی امان چاہتی ہے تو بھاگ جا، مگر وہ نہ مانی۔

میرن میاں مرزا جی کو روکے ہوئے تھے۔ بغیر ناک چونی کاٹ کے قتل کئے کوئی چارہ نہ تھا۔ ان کی ناک کٹ گئی۔ لا جو زندہ نچ گئی۔ اب وہ دنیا کو کیسے مومنہ دیکھا میں گے۔

”اماں“ ایک مال زادی کی خاطر پھانسی پر چڑھ جاؤ گے۔“

”پرواہ نہیں۔“

”میاں، طلاق دے دو سالی کو، اور چھٹی کرو۔“ میرن میاں نے سمجھایا۔ کوئی شریف زادی ہوتی تو اور بات تھی۔

مرزا نے اسی وقت طلاق دی۔ مبلغ ۳۲ روپے صراحتاً اس کے کپڑے لئے رامو کی دادی کے ہاں بھجوادیئے۔

لاجو کو جو طلاق کی خبر پہنچی تو جان میں جان آگئی۔۔۔۔۔ جیسے سر سے بوجھ اتر گیا۔ نکاح اسے راس نہیں آیا۔ یہ سب اسی مارے ہوا۔۔۔۔۔ چلو پاپ کٹا۔

”میاں اب تو تاراض نہیں؟“ اس نے رامو کی دادی سے پوچھا۔

تیری صورت نادیکھنا چاہویں، کہیں کہ یہاں سے مومنہ کالا کر جا۔“

مرزا کی طلاق کی خبر سارے محلے میں سرپت دوڑ گئی۔ فوراً لاہہ نے پیغام بھجوایا:

”بنگلہ تیار ہے۔“

”اس میں اپنی اماں کو بٹھا دے۔“ لاجو نے کھلوا دیا۔ مبلغ ۳۲ روپے میں سے دس اس نے بورڈ اور لاجنگ کے رامو کی دادی کو دیئے تک پا جائے شکورا کی بہو کے ہاتھ اوپنے پونے پیچ لئے۔ پندرہ دن میں لوٹ پیٹ کے کھڑی ہو گئی۔ کم بخت کی جیسے دھول جھڑ گئی جوتے لکھا کر اور نکھر آئی۔ کمر میں سو سو مل پڑنے لگے۔ پان کا بیردا لینے یا سیو کچوری لینے طوائی کی دوکان تک نکل جاتی تو ٹگلی کی چھل پہل بڑھ جاتی۔

مرزا کے دل پر آرے چلتے۔ ایک دن پتواڑی سے کھڑی الائچی کے دانوں پر جھگڑ رہی تھی۔ وہ مزہ لے رہا تھا۔ مرزا کئے کئے نظر بچا کے نکل گئے۔

”اماں تمہیں تو ہو گیا ہے خط! اب تمہاری بلا سے وہ کچھ کرتی پھرے۔ تم نے طلاق دے دی، تمہارا اب اس سے نیا رشتہ؟“

”وہ میری بیوی تھی۔ میں کیسے برداشت کر سکتا ہوں؟“ مرزا بگزے۔

”تو کیا ہوا؟ اب تو نہیں بیوی۔ اور پیچ پوچھو تو وہ تمہاری بیوی تھی ہی نہیں۔“

”اور نکاح جو ہوا تھا؟“

”قطعی ناجائز۔“

”یعنی کہ یہی...“

”ہوا ہی نہیں۔ برادر، نہ جانے وہ کس کی ناجائز اولاد ہو گی ناجائز سے نکاح حرام۔“ میرن میاں نے فتویٰ جزا۔

”تو نکاح ہوا ہی نہیں؟“

”قطعی نہیں۔“ بعد میں ملا جی نے بھی صادر کر دیا کہ حرامی اولاد سے نکاح جائز نہیں۔“

”تو ہماری، گویا کہ ناک وغیرہ بھی نہیں کئی۔“ مرزا کے سر سے بوجھ ہٹ گیا۔

”بالکل نہیں۔“

”بھی کمال ہے! تو پھر طلاق بھی نہیں ہوئی؟“

”بھائی میرے، نکاح ہی نہیں ہوا تو طلاق کیسے ہو سکتی ہے؟“

”مبلغ بیس روپے صرکے مفت ہی میں گئے!“ مرزا کو تاسف ہونے لگا۔

فوراً یہ خبر سارے محلے میں چھلانگیں مارنے لگی کہ مرزا کا ان کی گھروالی سے نکاح ہی نہیں ہوا۔ نہ طلاق ہوئی۔ مبلغ بیس روپے بے شک ڈوب گئے۔

لاجونے یہ خوش خبری سنی تو ناجاہلی، یعنی پر سے بوجھ پھسل گیا۔ نکاح اور ملاق ایک ڈراؤنا خواب تھا جو ختم ہو گیا تو جان چھوٹی۔ سب سے زیادہ خوشی تو اس بات کی تھی کہ میاں کی ناک نہیں کئی۔ اسے میاں کی عزت جانے کا بڑا دکھ تھا۔ حرامی ہونا کیسا وقت پر کام آیا! خدا نخواستہ اس وقت وہ کسی کی ناجائز اولاد ہوتی تو چھٹی ہو جاتی۔ رامو کی دادی کے گھر میں اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ زندگی میں کبھی یوں گھر کی مالکن بن کے بیٹھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اسے گھر کی فکر لگی ہوئی تھی۔ چوری چکاری کے ڈر سے میاں نے اتنے دن سے جھاڑو بھی نہیں دلوائی تھی۔ کوڑے کے انبار لگ رہے ہوں گے۔ وہ اس سورج اسی سے تھے لاجونے راستہ روک لیا۔

”پھر میاں کل سے کام پہ آ جاؤں۔“ وہ انھاں کی۔

”لا حول ولا قوہ!“ مزادر نیوز بائے لبے لبے ڈگ مارتے نکل گئے۔ دل میں سوچا، کوئی مامار کھنی ہی ہو گی، یہ بد ذات ہی سی۔ بات صاف ہو ہی گئی۔ لاجو نے کل دل کا انتظار نہیں کیا، چھتوں چھتوں گھر میں کو دگئی۔ نہنگے کا لگوٹ کسا اور جست گئی۔

شام کو مزدالوئے تو ایسا لگا مر جو مہ اماں آگئی ہوں۔ گھر صاف پندرن، لو با نیک بھینی بھینی خوشبو کو رے ملکے پر جھلسا! تا منجھا ہوا کنورا جی بھر آیا۔ چپ چاپ بھنا ہوا سالم اور رو غنی روئی کھاتے رہے۔ لاجو اپنی حیثیت کے مطابق دلیز پیٹھی پنکھا کرتی رہی۔

رات کو دو ٹاث کے پردے طاکر جب باورچی خانہ میں لینی تو مزدا پر پھر شدت کی پاس کا دورہ پڑا۔ جی مارے لینے اس کے کڑوں کی جھنکار سختے رہے۔ کروٹیں بدلتے رہے۔ جی ڈر رہا تھا، بڑی بے قدری کی تھی۔ انہوں نے اس کی۔ ”لا حول ولا قوہ!“ یکاکیک وہ بھنائے ہوئے انھے اور ٹاث پر سے گھر والی کو سمیٹ لیا۔



## تیراہاتھ

غزالہ نے انگوروں کی خالی نُکری دیوار پر کھینچ ماری۔

”لعنت، لعنت، لعنت!“ اس نے نظام عالم پر غصہ آتا۔ ہر نُکری خالی! اسے کئی روز سے پڑھا کہ انگوروں کی نُکری خالی ہو چکی ہے۔ پھر بھی خالی بنوے خالی شکرداری خالی مرتبان اور خالی ڈبوں میں ہاتھ عادتاً ”رینگ جاتا۔ اس خالی پن پر اسے بست جمنجلا ہٹ ہو رہی تھی۔

اور پھر امی کی خالی آنکھوں سے تو اسے ڈر لگنے لگا۔ اماں جان سے اما جانی اور پھر تاویلی میں وہ امی بن گئی تھیں، نہ جانے اسے کیوں جلدی پڑی رہتی۔ ایسی گفتگو کہ آدھے الفاظ اور پورا مطلب ہی بات کا ختم ہو جاتا۔ چلتی تو یوں جیسے لپک جھپک بھاگ رہی ہے۔

”بیٹی جان لڑکیاں یوں بچھڑوں کی طریوں دھمادھم نہیں چلا کرتیں۔ کنوواری لڑکیوں کی حال میں نزاکت ہو جانا چاہئے۔ جیسے نیم سحر خراماں خراماں سبزہ زاروں پر اٹکھیلیاں کرتی..... امی کو کھانسی نے آدیو چاودرنہ وہ بے حد حسین بات کرنے جا رہی تھیں۔

امی کی کھانسی انتہائی ڈراوے نے سُراختیار کرتی جا رہی تھی۔ رب سوس، بفس، قسم ریحال الم غلم ان کی کھانسی سے نبرد آزمائیں ہو پا رہا تھا۔ امی کو جب بھی کھانسی زکام کی شکایت ہو جاتی تانا حضور انہیں شملہ یا دہرہ دون لے جایا کرتے

تھے۔ اللہ آمن کی دو بیٹیاں تھیں۔ خالہ اماں اور امی کے درمیان کتنے ہی ماموں خلا میں پیدا ہوئیں لیکن ان دو کے سوا قسمت میں اولاد ہی نہ تھی۔ خالہ اماں پاکستان چلی گئی تھیں اور نھائیہ کر رہی تھیں، سب اولادیں کامیاب شادیاں کر کے عرب ملکوں، امریکہ اور انگلینڈ میں جم چکی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کے ذخیروں کو سلامت رکھے کتنے کنبوں کو پال رہا ہے۔

کبھی دن اچھے تھے۔ ابا حضور کا دبدبہ تھا۔ کھلے ہاتھ کا خرچ۔ ولایتی مسماں آیا کرتے تھے۔ شار کا غلغله مچتا۔ گھر میں ان گنت لونڈیاں باندیاں ملازم چھو کرے بھرے پڑے تھے۔ اکتوبر میں غزالہ ماں باپ کی آنکھوں کا تارا تھی۔ کتنے ناز انھائے جاتے تھے اس کے۔ کانونیٹ میں تعلیم ملی۔ مگر سینئر کیرسج کرنے سے پہلے ہی حالات کا منہ ڈھل گیا۔ ابا جان اچھے بھلے شکار کو گئے۔ واپس لاش آئی! بارٹ فیل ہو گیا۔ نہ جانے گرل فرنڈ اور یار دوست کماں پھر سے اڑ گئے، گاؤں کے لوگ لاش لے کر آئے اور ایک آدمی کی موت سارے ٹاث پان کی موت ثابت ہوئی۔ امی کے تو ہوش و حراس گم ہو گئے۔ ابا حضور ادھر ادھر منہ مارتے تھے مگر بیکم سے ہمیشہ آپ جناب سے بات کرتے تھے۔ خالہ اماں بڑی طرار تھیں۔ پڑھی نہ لکھی مگر اچھی خاصی پائیشن تھیں۔ غالومیاں کو جوئی کی نوک کے نیچے دبا کر رکھتی تھیں۔ آنھے نیچے ہوئے بھی دم خم وہی تھا۔ غالومیاں دطن چھوڑنے پر کسی طرح تیار نہ ہوتے تھے مگر انہوں نے دو تین بیس میں نیچے پار کئے اور سب کچھ اونے پونے نیچے میاں کی نکیل پکڑ چل دیں۔ امی آہیں بھرتی رہ گئیں۔ ابا حضور نے پہنچے پر ہاتھ ہی نہ دھرنے دیا۔

غزالہ نے انہیں کبھی سنجیدہ نہیں دیکھا۔ وہ بھی بیٹی کی طرح بے چین بولنے تھے۔ دو گھنٹی تھم کر سوچتا مستقبل پر نظر ڈالنا ان کے خیر ہی میں نہ تھا۔ سانو لا سلو نارنگ، دراز قد، خاصے بار برا کارت لینڈ کے ہیرو تھے۔ کیا با نکے انداز سے گھنے بالوں والے سر برہیٹ لگاتے تھے اور کالا چشمہ، انتہائی رنگیں اور پراسرار۔ ای لاکھ ان سے رو تھیں جل تھل آنسو بھائیں۔ وہ نہایت ڈھٹائی سے دنادن عشق

دا غتے۔ جب ایک گرل فرنڈ سے مار کٹائی تک نوبت پہنچ جاتی تو فلیش کی جینجیں، شکار پارٹیاں، کلب بازی اور وہ سکی کے دور! غزالہ نے ہمیشہ ان کے منہ سے بھکے نکلتے سو نگھے۔ جب بھی وہ اسے پار کرتے اور کئے جاتے یہاں تک کہ وہ روپڑتی کہ ان بھکوں سے اسے متلی ہونے لگتی تھی۔ تب وہ کچھ کھیانے سے گدی کھاتے باہر چھے جاتے۔

ای نسوانیت کی پوت تھیں۔ فخر کی نماز پڑھ کر ہلاکا سانشہ کرتیں۔ دھان پان تو تھیں ہی۔ نیس لباس پس کر آمنہ بی سے چویں گندھواتیں۔ پودر لپٹک بھی لگاتیں اور پان کی دھڑی بھی جماتیں۔

”بیٹی جان بن سور کر رہا کرو۔ مرد کا دل جیتنے کے لئے جتن کرنے پڑتے ہیں۔“

مگر مرد کم بخت گھر میں تک جب نہ۔ صبح جاتا ہے، رات گئے بنکارتادندنا آنے میں دعست آتا ہے اور کپڑے بدلتے سے پسلے عافل ہو جاتا ہے۔ ای نسوانیت روہانی، اختلاج قلب کی بیمار، حیرت زده بے بسی تکر دیکھا کرتیں اور آنسو بھایا کرتیں۔ نہ جانے اسی کی آنکھوں میں کتنا پانی بھرا تھا۔ روہاں پر روہاں بھگوتیں۔ ابا حضور آنسو کی پہلی ہی بوند پر سیلاپ زده مخلوق کی طرح گدی کھاتے باہر بھاگتے اور پھر ان کے گھوڑے کی ٹاپوں کی گونج پر اسی کچھ اور آنسو بھاکر شل ہو جاتیں۔ کاش وہ ان کی گرل فرنڈس کی طرح اونچے اونچے قمیسے لگا کر ولایتی گالیاں بک سکتیں۔ گھوڑے پر ان کے ساتھ شکار پر جا سکتیں۔ دو گھونٹ وہ سکی ہی پی لیتیں۔ کیسی کیسی ابا حضور نے متفق کیں۔

”بیگم، میری جان ایک گھونٹ چکھ کر تو دیکھو چودہ طبق روشن ہو جائیں گے بندا!“ اسی کے نرم نازک ہونٹ لرزتے اور آنسوؤں کے آبشار چل پڑتے۔

خالہ اماں ایک بذات وہ اپنے ہاتھ سے پینٹ بنا کر میاں کو دیتیں اور جب وہ ضد کرتے تو گلاس میں آوھا اچھ وہ سکی میں لبائب سوڈا چھوڑ کر ساتھ دینے لگتیں۔ خداۓ مجازی کا حکم عورت کے لئے حکم خدا کے بعد کا درجہ رکھتا ہے۔

ویے ان کی کنیز گلزار کا کہنا تھا۔ جب میاں نہیں بھی تھے تو بیگم صاحب اکیلی ہی پیالہ پیگ مارتی ہیں۔ نوابی خاندانوں میں رواج عام ہے۔ خواتین ڈٹ کر پیتی ہیں۔ ویے کھاتے پیتے خاندانوں میں بھی خواتین پر ہیز نہیں کرتیں، اور نچلے طبقے میں تو چلتی ہی ہے کندھی کی "اپرا۔"

لیکن اب غزالہ کی سمجھ نے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کانونیت کی فیس ادا نہ کرنے کیوں جسے وہ ابا حضور کے سامنے ہی نکال دی گئی تھی۔ وہ بے حد برافروختہ ہوئے تھے اور کانونیت کی ایسٹ سے ایسٹ بجا دینے کی دھمکی دی گئی۔ پھر شاید بھول بھال گئے۔ کیا ہنگامے تھے کہ غریب کو دم مارنے کی فرصت نہ تھی اور پھر بارٹ انیک نے آن دروچا۔

شکر ہے کہ بچپن ہی سے فرفراگری بولنے کی مشق تھی۔ مگر میرک کا سرٹیفیکٹ بھی نہ تھا۔ جب ابا حضور کے بارٹ فیل ہونے کے بعد پتہ چلا معاملہ بالکل کھکھل ہے اور اس پرانی کوئی کے سوا کوئی اور سارا نہیں تو حواس گم ہو گئے۔ پاکستان سے دولہا وصول کرنے کی بھی امیدیں ختم ہو چکی تھیں۔ خالہ اماں کے سب لڑکے بڑی امیر سرالوں میں کھپ چکے تھے۔ ایک ولایتی میم کے ساتھ انگلینڈ میں جمیک چکے تھے۔ ساری سیلیاں جو بچپن سے غزالہ کو اپنی بوبنانے کی دھمکیاں دیا کرتی تھیں نہ جانے کہاں غارت ہو گئی تھیں۔

ایک بوارہ گئی تھیں۔ درش میں ملی تھیں تو شخواہ تو دنیا نہیں پڑتی تھی۔ میاں چھوڑ کر نہ جانے کہاں اڑن چھو ہو گیا تھا۔ ایک میر صاحب تھے ساری عمر مکتب میں قرآن اور اردو پڑھائی۔ پھر ابا حضور نے فرشی کا عمدہ دے دیا۔ جب آنکھوں سے لاچار ہوئے تو ڈیوٹی پر موذھا ڈالے بیٹھے رہتے تھے۔ ان کا ایک گھاٹر سالزا کا تھا غفورا اور پر کام کیا کرتا تھا۔ نہاتی مسکین اور بزرگ ابا حضور ایک دن شکار پر لے گئے تو بندوق کے دھماکے سے لرز کر روکے گا۔ یہ سیر کافی ڈھیلے ہوتے ہیں۔ جب کوئی کے مکینوں پر براؤقت پڑا تو میر صاحب تو بالکل ہی چھپس ہو گئے تھے۔ مسجد میں جا بیٹھے تھے۔ اللہ کے نیک بندے سال میں ایک آدھ جوڑا بھی دے دیتے۔

ویے جب منگائی نہ تھی تو ملا بھی سنک کھا دیتا تھا۔ انہوں نے کبھی ہاتھ نہ پھیلایا پر  
نیک بندوں کے دل میں کبھی ترس جاگتا تو پیٹ کا سمارا ہو، ہی جاتا۔

غفورا جو توں کے ایک کارخانہ میں کام سیکھ کر کچھ کمانے لگا۔ اور جب میر صاحب اللہ کو پیارے ہوئے تو وہ دنیا میں اکیلا رہ گیا۔ ذہنی طور پر تو وہ ہمیشہ کا تیتم تھا۔

کافی عرصہ سے غزالہ کو عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ غفورا جب بھی کسی کام سے آتا چوری چوری اسے تاکا کرتا۔ لیکن جیسے ہی وہ اس کی نظر کو پکڑنا چاہتی، پلکیں جھکا لیتا۔ غزالہ کو اس سے چڑھتی۔ بے ہنگم لمبا کندھے جھکے خشنخاشی بال، خدا جانے کس رنگ کے ہوں گے۔ سفید چندیا پر اتنی حقیر پیداوار خاک رنگ جماتی۔ بڑے بڑے کان، بڑے بڑے ہاتھ پاؤں، عجب اونٹ جیسی اچکتی ہوئی چال دانت پتہ نہیں کیسے ہوں گے۔ کبھی ہستا ہی نہیں جو پتہ چلے۔ آنکھ ملائے تو پتلیوں کا رنگ معلوم ہوا۔ اونچا شرعی پاجامہ نیچا کرتا اور زرد مشین کے کام کی کلف دار نوی۔ بالکل میر صاحب جیسا لباس روزے نماز کا نہایت یا بند۔

اسے ہمیشہ گجالانیبی کرتا تھا۔ حالانکہ وہ اب بیسی نہیں رہی تھی۔ چوبیسوں  
برس چل رہا تھا۔ مگر امی ہمیشہ اس کی عمر میں سے خاصے ڈھیروں سال ہڑپ کر جاتی  
تھیں۔ وہ اسے بیس سے اوپر اٹھتی دیکھنے کو تیار نہیں تھیں۔ انہارہ برس کی عمر میں  
تو ان کی گود بھر گئی تھی۔ پھر پوت جاتا رہا تو دو سال بعد غزالہ پیدا ہوئی۔ زیادہ سے  
زیادہ چوالیس برس کی ہوں گی مگر کافی بال سفید ہو گئے تھے۔ جلد کو پھیلنے کی گنجائش  
نہ ملی تھی کہ جسم پر گوشت ہی کم تھا۔

”گالا میںی - ”غفورا کے ربڑ کے جوتے دہنیزیر رکھ کر اس نے نظر نہ اٹھائی۔

”غفورا تمہارے حلق میں کیا موری کی کچھ بخشی ہے؟“

”جی.....جی..... نہیں تو“ نظریں پھی۔

"تو پھر تم غ کو گاف اور رکوج کیوں بولتے ہو۔ میرا نام گجالا نہیں، غزالہ

1

”جی گجالا۔“

”پاجی کمیں کا بن رہا ہے۔“ غزالہ چڑھنی۔ امی نے کوئی نرم ساتھ کیوں نہ رکھا۔ کانونیت میں لڑکیاں اور استانیاں غ نہیں بول پاتیں۔ غ خ ق نہایت خوفناک آوازیں ہیں نہ انگریزی میں نہ ہندی میں۔ بس ڈھا گاڑا پھا بھی تو جیٹھی تھی۔

”ہم بھی آج سے تمیں گھپورا کمیں گے سمجھے۔“

”جی!“ غفورا کو پسلے ہی اس کے یار دوست گھپورا کرتے تھے۔ احتجاج کی کوئی وجہ نہ نظر آئی۔

”غین حلق سے نہیں نکلتی؟“

”جی نکلتی ہے۔“

”تو بولو فیں۔“

”جی گیں!“

غزالہ کا پارہ چڑھ گیا۔ جان کو آگئی، بالکل سر پر سوار ہو گئی۔ ”کہیں آج تمیں غ بلوا کر چھوڑوں گی!“ غفورا کی گھنگھی بندھ گئی۔ بھاگ بھی نہ سکتا تھا۔ غزالہ بسی سے اس کا دم نکلتا تھا۔ کیا تیا بر کی طرح خنبھاتی تھیں۔ اس کے کان لال ہو گئے۔ کم بخت کتھے کے رنگ کا ہو گیا تھا۔ امی کستی تھیں جب چھوٹا سا تھا تو پھول کی طرح سرخ پسید تھا۔ برتن جھاڑو اور پھردھوپ میں جمل کے رہ گیا۔

غزالہ کی سیلیاں ہائیڈ رو جن اور ایمونیا ملا کر بلجنگ کیا کرتی تھیں۔ اس کا جی چاہا غفورا کو اسی محلوں کے قرابے میں ڈبو دے اور اتنی دری بھگوئے رکھے کہ اس کے جسم ہی نہیں روح کا بھی بلجنگوا پن اتر جائے۔ لیکن اس وقت تو اسے غین اور بلوانا تھا۔

”بیٹھ جاؤ۔“

غفورا مینڈک کی طرح اکڑوں بیٹھ گیا۔

”نمیں نہیں۔“ وہ لپک کر کھڑا ہو گیا۔

”ادھر اسٹول پر جیخو۔“

”غفورا نئی دلمن کی طرح سمت کر دونوں ہاتھ گود میں رکھ کر بیٹھ گیا۔ آنکھیں تلے!

؟ غفورا تمہاری کیا عمر ہے؟“

”جی..... پتہ نہیں۔“

”کمال ہے، یعنی پتہ ہی نہیں؟“

”بہت دن ہوئے ابا کہتے تھے چودہ برس کا ہوں۔“

”کتنے دن ہوئے؟ کوئی تین دن۔“

”نہیں.... بہت سال۔ جب ابا زندہ تھے۔ اور سرکار بھی زندہ تھے۔“

”غفورا تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟“

”نہیں..... نہیں یہی..... میں کیسے..... نہیں نہیں۔“

”ارے احمق، اتنا بوكھلانے کی کیا بات ہے۔“ مگر غفورا کے کان اتنے سرخ ہو گئے کہ غزالہ ڈری کیسی نپک نہ پڑیں پکے ٹماڑوں کی طرح۔ وہ ایسی بدھونہ تھی کہ غفورا کی نگاہوں کا پیغام اس کے بھیجے تک نہ پہنچا ہو۔ مگر اسے قطعی اپنی انسٹ محسوس نہ ہوئی۔ بس ہمی آئی۔ اف اتنا یور احمق کون بد نصیب جھیلے گی۔

پھر اسے غفورا پر ترس آگیا۔ مالی طور پر اس کی حالت غزالہ سے خیمت تھی کہ وہ تو کوڑی بھی نہیں کھاتی تھی۔ لیکن ذہنی طور پر غفورا کتنا محروم تھا۔ اس کے عالم فاضل باپ نے صرف اسے قرآن پڑھایا وہ بھی بے معنی کے۔ پھر اردو کا قاعدہ شروع کرایا تو کام سے فرصت ہی نہ ملی۔ غزالہ کو انسوں نے قرآن کے ساتھ آمد نامہ بھی رٹا دیا تھا۔

آمن آنا۔۔۔ آمد، آیا۔ آمدید، آئے.....!

پھر تھوڑی سی اردو بھی پڑھ ڈالی تھی۔ اردو میں تھا ہی کیا پڑھنے کو اس کے کانونیت میں تو بتایا ہی نہیں کسی نے۔ اس کے کانونیت میں آنھوں سے بندی شروع ہو گئی تھی۔ پتلی سی کتاب تھی۔ لا کیاں رٹ کر ہندی میں تھرڈ ڈویژن مارک

لے آتی تھیں۔ کم بخخت پوزیشن گر جاتی تھی۔ اس سے تو سنکرت اچھی بارہ چھوٹے چھوٹے اشلوک رٹ ڈالوں پخانوے نہر ملے دصرے ہیں۔

اف اسکول سے کیسی جان چلتی تھی۔ جب اسکول چھوٹا تو جیسے پیروں تلے سے زمین کھک گئی۔ خیر انگریزی کے سارے وہ لا بیربری سے چار آنے فی ہفتہ کتاب ڈھیروں لے آتی تھی۔ لا بیربریں تقاضا نہیں کرتا تھا۔ کافی روپے چڑھ گئے تھے۔ جو بہت مشکل سے ادا کئے اور اس کے بعد وہ کباڑیے کی دکان سے پرانی انگریزی کتابیں اور رسالے دو آنے ہفتہ پر لے آتی۔ زیادہ تر مزائینڈ بون کے اور باہرا کا رٹ لینڈ کے تاریخی رومان اسے پسند آتے۔ دن میں ایک کتاب آسانی سے ڈکار لیتی۔ ان کتابوں میں اس کی اپنی محرومیوں کے لئے مرہم تھا۔ چھ سات برس سے وہ انہی رومانوں کی رنگین فضاوں میں محو پرواز تھی۔ ان سب رومانوں کی ہیروئنیں بالکل اسی کی طرح غریب مگر نمایت حسین اور پاکباز تھیں۔ بڑے دکھ انھاتی تھیں۔ نمایت امیر اور بے حد مال، ڈاک اور ہینڈ سم سے نکر ہو جاتی۔ بے حد اکڑا اور بد مزاج اکھرا۔ عورت ذات سے تنفر آوارہ بد معاش، اس نازک اندام پھول جیسی ہیروئن کا بے حد دھوپی گھاث کرتا۔ تو زتا مرڈتا اور جلتے سمجھتے بوسوں کی بارش میں اسے بھونتا جھلتا۔ اس کا تن من اس ظالم درندے کے عشق میں چکل کر موسم ہو جاتا۔ وہ نامراد نوتا ہوا دل لے کر بھاگتی تب وہ اس نے پیچھے ڈوڈتا اور بتاتا کہ وہ کس بری طرح اس پر زندگی میں پہلی اور آخری بار دل و جان سے اور روح کی گمراہیوں سے عاشق ہوا ہے۔ اور وہ اس سے شادی کر لیتا۔ نہی خوشی بیتے لگتی۔

لیکن اس نامراد ملک میں اس کے نصیب کے تمام ڈیشنگ ہیرو صرف امیر لڑکوں پر عاشق ہوتے ہیں اور شادی کر کے ڈھیلے موٹے بھس ہونے لگتے ہیں۔ وہ ایک بار لا بیربری میں اسے لڑکوں نے میٹھی نظر سے دیکھا کافی کی دعوت بھی دی سینما بھی دکھایا۔ مگر بد لے میں نمایت ٹوٹنے پر مصر ہوئے اور سخت ناگوار ماحول میں اسے جان چھڑانی پڑی۔

ایک دفعہ ایک کافی چند سم اور امیر لڑکا اس کے پیچھے لگا۔ خوب موڑ دوڑائی اس کے بال ہوا میں اڑے۔ مگر جب ایک نہایت میلے ہوش کے کمرے میں وہ ایک دم اس پر چڑھ بیٹھا تو اس نے اس کے بازوؤں میں دانت گزودیئے۔ ”یونچ“ اس نے گالی دی اور وہ زقد مار کے باہر نکل گئی۔ وہ اس کے پیچھے بہت خوشامدیں کرتا گا رہا مگر نہ جانے کیوں وہ قطعی نہ پکھلی۔ وہ اسے نہایت گندی گالیاں دیتا موڑ بھنا تا۔ اسے گھر سے میلوں دور چھوڑ کر چلتا ہنا۔ گھنٹوں پیدل اور پھر کھڑکھڑاتی بس میں رکرتی گھر پنجی تو غفورا نے اسے پھر گجالا کہہ کر خون تھکایا۔ اگر وہ اتنا دور اور اونچا نہ ہوتا تو وہ ضرور اس کے منہ پر چانٹا جما دیتی۔

انتقاماً“ اس نے غفورا کو دھر گھینٹا۔

”کہو غا آ آ۔“

”گا..... آ۔“ غفورا روہانا ہو گیا۔

”نا.....“

”ارے کیوں ٹھوڑے کو ہلکاں کر رہی ہے۔ بیٹی غزل!“ وہ ہمیشہ اسے بڑے رومنی ناموں سے پکارا کرتی۔

ٹھوڑے دن تو وہ خود کو سین بھختی رہی کہ ہر نواب زادی نازک اندام اور رمشک ہوتی ہے۔ اس کی نسوانیت شرم و حیا نہ زاکت لطافت مسحور کرن ہوتی ہے۔ لیکن اسے معلوم ہو گیا تھا کہ کماو دولتمند دو لمحاء کے لئے دولت مند یوی ہی سب سے بڑی ماہ لقا ہوتی ہے اور نسوانیت نہ زاکت لطافت اور شرم و حیا کا تقاضا ہے کہ یوی مر معاف کر دے اور جائیداد خداۓ مجازی کے نام۔

اس میں کیا عیب کی بات ہے۔ موجودہ حالات میں اگر وہ بھی کماو پوت ہوتی تو کافی بھینگی مگر بے حد امیر دلمن بیاہ کے لاتی کہ کوئی بھی کی مرمت ہو جاتی۔ دکانداروں کے قرض اتر جاتے اور امی کو پہاڑ پر آرام کے لئے کسی سینی نوریم میں داخل کروادیتی۔ تب واقعی اسے وہ بد شکل یوی پریزاد لگتی، اور پہلی فرصت میں وہ کوئی حسین چھوکری ڈھونڈ کر اس کے ساتھ بیش اڑاتی۔ جاہل ہیں، وہ لوگ جو

دولت پر تاک بھوں چڑھاتے ہیں۔ بنتے ہیں، جو ریاست کو حقارت سے دیکھتے ہیں اور غربی کو خدا کی رحمت سمجھتے ہیں۔

اگر اور پر سے کوئی غ کو گ، ز کو جیم اور ف کو پچہ کے تو قتل کی وہ مجرم ہرگز نہ ہوگی۔ اسے چھانسی دینا ذہنی اور اخلاقی پستی کا ثبوت ہو گا۔ اس پر مادیت چھارہی تھی کسی کو جلانے ذلیل کرنے اور ٹھکرانے کو جی چاہ رہا تھا۔ اسے دور دور غفورا کے سوا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اور جب اس نے اکڑ کر کما۔

اور جب چوکے پر دستِ خوان لگا کر غفورا حسب عادت کہ میز پر پیملی پونچھنے بینھ گیا تو غزالہ کا پارہ زنازن اور پر چڑھنے لگا۔

”چھوڑو پیملی گدھے!“

غفورا نے در کے پیملی سے ہاتھ کھینچ لئے۔

”یہاں بینھ کے کھاؤ۔“ اس نے دستِ خوان کے کونے کی طرف اشارہ کیا۔ امی لوکی کا شوربہ پی رہی تھیں۔ نتھنے پھر کرنے لگے۔ انگریزی میں بولیں۔  
”ڈونٹ لی سلی!“

اس نے بھی انگریزی میں جواب دیا۔

”آئی ایم نوت سلی، یہ بھی انسان کا بچہ ہے کتا نہیں۔ سید ہے، پھنانوں سے اوپنجا آل رسول! اور ہمارے رسول تو غلاموں کو ساتھ بٹھا کر کھلاتے تھے۔“

امی کافی کمی مسلمان تھیں۔ بینھ کر صرف فرض پر جتنیں مگر نماز مشکل ہی سے قضا کرتیں۔ مگر اسلام کے ایسے اشتراک اور مساوات کے اصولوں پر صرف زبانی جمع خرج کی قائل تھیں۔

”جا غفورا پلیٹ لا!“

غفورا پلیٹ لایا اور سما سما اکڑوں بینھنے لگا تو وہ دھاڑی۔

”پالتی مار کے بیٹھو۔“

غفورا کی پالتی ایسی پھرتی سے مری کہ غزالہ کو اچھوگ کیا۔

غفورا کا دم گھٹ رہا تھا۔ نوالہ نگتے ہی سسم جاتا کہ کمیں نگنے کا دھماکہ تھی کو چونکا نہ دے۔ غزالہ کو محسوس ہوا جیسے وہ ملزاں ڈبوں یا باربرا کارت لیڈ کاؤ۔ سنگ بے رحم لکھ پتی مرد ہے اور غفورا نادار نازک اندام کنواری حسینہ ہے۔ اور اسے چاہیے کہ حسینہ کو پچھاڑ کر اس پر دیکھتے ہوئے بوسوں کی بارش کر دے اور کہے۔

”ڈارلنگ، آئی لو یو سو!“

مڑوہ زور سے نہیں بھی نہیں غفورا کے لال انگارہ کان دیکھ کر دھمکی ہو گئی۔ یہ نہیں کہ اس کے لئے پیغام ہی نہیں آئے۔ بوڑھے دوہا جو یا کلر کوں کے دیے کوئی خنثی کھنڈر سی کافی رقبہ پر کھنڈر پھیلا تھا چھپے جہاں کبھی پھلن سے لدا باغ بیلا چنبلی اور گاب کے تختے کھلے رہا کرتے تھے۔ سنگ مرمر کے تالاب میں سرخ مچھلیاں تیرا کرتی تھیں۔ تھوڑا بھٹ کھٹیا اور بول کے سوال سب پیڑ بوڑھے ہو کر کچھ دن ایندھن کے کام اور ٹال والے کے ہاتھ نیچنے پر دال دلیہ کے کام آگئے تھے۔

مگر ایک دن وہ چونک پڑی۔ وہ صاحب جنہوں نے خالہ اماں کی کوئی خریدی تھی ان کا کارندہ آیا اور کوئی کا تخمینہ معلوم کرنے لگا۔ غزالہ نے کبھی کوئی کی قیمت پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ ایک دفعہ اور ذکر چھڑا تھا تو اسی بے حد روئی تھیں۔

”نہیں میں آپا جان کی طرح بزرگوں کی بخشی جائیداد نہیں بخوبیں گی۔ اسی پر اسے آج بست غصہ آرہا تھا اگر وہ سینٹر کی سرچ کر لیتی تو زندگی بن جاتی، وہ یونی شادی کے کالم دیکھا کرتی تھی ان ہی کانوینٹ کی پڑھی لڑکیوں کی خاصی مانگ تھی خاص طور پر باہر بڑی بڑی تینخواہوں پر لگے ہوئے دولہا کی طرف سے اس نے کارندے سے کہا ”اس وقت اسی سورہی ہیں کل پرسوں جواب دیں گے۔“

پھر اسی نے بتایا کوئی کے کانڈات اندر کے کمرے میں مچان پر کالے صندوق میں رکھے ہیں۔ جب غفورا آیا اس نے مچان پر چڑھ کر پسلے تو جالے اور

خاک دھول جھاڑی پھر بڑی مشکل سے تلا کھولا۔ کاغذات کے انبار میں پہلا لفافہ ڈھونڈ کر نکلا اس میں نہ جانے کون سے کاغذات تھے۔ جاہل لٹھ غفورا پر اسے بت غصہ آیا۔

”یچے اترو۔“ غفورا سمسم کرا اتر آیا۔ اور وہ خود چڑھنے لگی۔ مگر پھر پڑی۔ بندر کی اولاد کیا پھرتی سے چڑھ گیا اور اس کے پھسلنے پر ہنس بھی رہا تھا۔ وہ اس پر برس ہی پڑتی لیکن بار اس کے اجلے دانتوں کی قطار دیکھ کر سکتے میں رہ گئی۔ بچپن میں تو اس کے دانت بڑے او بڑ کھابز تھے۔

”ای کرو۔“

”جی؟“

”کرو۔ ای، یہی۔“ اس نے دانت کھوس کر بتایا۔

”ای۔ یہی۔“ غفورا نے نقل کی۔

”اے واہ پچھے تمہارے دانت تو ایک دم بنا کا نو تھہ پیٹ کا اشتمار ہیں!“ وہ گردن ٹیز ہمی کر کے اسے غور سے دیکھنے لگی۔ یعنی گودر میں لال چھپا تھا اور اس نے نوٹس ہی نہ لیا۔ مہاگدھی!

تحوڑی ہتھیلی پر رکھے وہ سوچتی رہی۔

اگر غفورا کو بنا سنوار کر چلایا جائے تو چل جائے گا۔ ایک دن اس کی سیلی نے کہا تھا۔

”ہائے، سو کیوٹ!“

اگر دھویا مانجا جائے تو غفورا کافی کیوٹ رہے گا۔ اور کم بخت بال خشناشی کر کے کدو جیسی کھوپڑی پر اگر الیوس پر سلے کا دگ لگا کر نام جوزہ کی نائیٹ جیسن۔ مارو لس! کم بخت جوتے گانٹھنے سے بہتر ہے۔ فٹ کلاس جگہ بن سکتا ہے۔

”غفورا اگر اب کے تم نے بال کٹوائے تو سمجھ لو تمہاری چپل سے ایسی چاند گنجی کی جائے گی کہ بس!“

”جی؟“ غفورا بد کا۔

”بال کثانا ایک دم بند، ہم کا نیس گے تمہارے بال خود اور ہاں یہ موچھیں،  
راج کپور کٹ نہیں چلیں گی۔ چھوڑ دو۔“

”چھوڑ دوں؟“

”یعنی بڑھنے دو بس بال اور موچھیں بے مہار بڑھنے دو۔“

”مگر گجالا نہیں!“

”ہت تیرے کی، نامراد غمین بھی جاں بحق تسلیم ہوئی۔“

”غزالہ یوں ۔۔۔“

”اندر چھوڑ دیے غمین ف قاف تمہارے بس کے نہیں۔ کل تم انگریزی پڑھو  
گے۔“

”اے بی سی ڈی تو اباجی نے سکھادی تھی، سی اے لی کیٹ ۔۔۔ کیٹ  
مانے بلی۔ آرائے لی ریٹ۔ ریٹ مانے چوہا۔“

”بدھو کیٹ معنی بلا بھی تو ہو سکتا ہے۔ اور ریٹ کی مادہ بھی ہوتی ہے۔“

”ہی کیٹ اور شی کیٹ۔“

”اڑے بھوندو تم تو چھپے رسم نکلے! اچھا بس اوہر آؤ۔۔۔“ غفورا شرماتا الجاتا  
برہما۔

”جھکو!“

”جی!“

”ہم کستے ہیں جھکو تمہاری پیٹھ پر چڑھنا ہے۔“

”نہیں۔۔۔!“

”اوہ نہہ اویٹ جھکو!“ غفورا جھک گیا اور وہ اس کی پیٹھ پھر کندھوں پر چڑھ  
گئی۔

”ہاں اب ہولے ہولے کھڑے ہو ایسا ہے اگر میں گری تو تمہاری جان  
کی خیر نہیں!“

مچان پر چڑھ کر وہ کاغذ ڈھونڈتی رہی اور غفورا بھاگ کر گیا اور عل کے نیچے

کان ٹھنڈے کرنے لگا۔ دو تین دن تک صاحب کا کارندہ نہیں پڑا۔ اسے بھی نہیں معلوم تھا۔۔۔ کیسے سودا شروع کرے۔

لیکن دوسرے دن ایک اور آدمی موڑ میں آیا، کوئی اور محققہ زمین کی قیمت پوچھی۔“

”ہم اپنے دکیل سے بات کر کے بتائیں گے۔ آپ کل آئیے۔“  
اگر دوسرا آدمی نہ آتا اور خود سینہ ریشم چندر تو وہ دوبارہ سوچتی بھی نہیں۔  
”نا بھی، مسلمان بھائی کو دیں گے کوئی۔ اپنا خیال کرے گا۔“  
یوپار میں ہندو مسلمان کی کیا قید، دونوں میں سے جو زیادہ دام دے گا۔“  
”مگر۔“

”ای، پیسے کا کوئی دھرم نہیں ہوتا۔ بس کمی اور افراط کی لٹکر ہوتی ہے۔  
اور تیرے دن خلیق الزماں صاحب کے لڑکے کے لئے غزالہ کا پیغام آگیا۔  
ای تو روپڑیں، وہ ناامید ہو چکی تھیں کہ پچھی کا نصیبہ کبھی نہ کھلے گا۔ مگر خدا کے سیاں دیر ہے اندر ہیر نہیں۔“ اپنی ذات پات کا بھی ہے۔ تیل کا کارخانہ ہے باپ کا۔ اپنی وکالت بھی کرتا ہے ہائے میری لاڈلی کے ہاتھوں میں مہندی رچے خیرے اپنے گھر بار کی ہو۔“ ای دیر تک وظیفہ پڑھتی رہیں اور غزالہ پر پھونکتی رہیں۔  
”سینہ اور کھاں صاحب ایکشن میں کھڑے ہو رہے ہیں۔“ غفورانے کہا اور خ صاحب نہ بولنے پر غصہ کی بجائے نہ جانے کیوں غزالہ کو سرت ہوئی۔

شام کو احسان خالو آئے۔ ابا حضور کے جنازے میں شرکت کر کے جو گئے تو آج پلٹے اور آتے ہی ای پر قربان ہونے لگے ٹھنڈی آہ بھر کے بولے۔

”ہماری تمہاری ٹھیکرے کی مانگ تھی مگر قسمت کو اور کچھ ہی منظور تھا۔  
تمہاری اس ناقدرے سے ہو گئی اور میری کنیز فاطمہ سے قسمت پھولی۔“

”کیسی ہیں کنیز آپا؟“ ای کے چہرے پر دو بوند خون بھر گیا۔

”وہی رفاربے ڈھنگی جو پلے تھی سواب بھی ہے۔ دوستوں کا طعنہ۔ قولی  
سننے پر دانتا کل کل۔ لڑکیاں جوان کوئی ٹھکانا ہے مصیبتوں کا لڑکے چاہتے ہیں۔“

پڑھی کھنچی کماو بیوی۔ کہو بے شرم بیوی کی کمالی پر عیش کرو گے!“  
شنزادی بیکم تو خدا کے فضل سے اب۔۔۔ میرا خیال ہے مجھ سے آٹھ نو  
برس چھوٹی ہوں گی۔

کیا بتاؤں لکھجے پر چنان پر رکھیں اور نامرا دیں تینوں نیوال پر پڑھیں،  
جاوید میرے اوپر گیا سودہ پاکستان چلا گیا۔“  
”سنا شادی کر لی ہے۔

”ہاں بڑے جنzel کی بیٹی ہے ناک پر کھنچی نہیں بیٹھنے دیتی۔ پچھلے سال ہم دونوں  
چلے ہی گئے۔ صورت کو ترس گئے تھے۔ ہر سال یہی قصہ کہ ”آئندہ سال آؤں گا۔  
میری بدلتی ہونے والی ہے۔“ میں نے کہا ایسی تیسی بدلتی کی۔ مگر جا کے پچھتا ہے۔  
بس ایک کمرے میں بند رہو۔ ڈرائیک روم میں پارٹیاں چل رہی ہیں۔ بہت کہا  
تمہاری آپا سے بھلی مانس ٹنگ پاجامہ چھوڑ کرتی ہے چھے گز لٹھا چلتا ہے غارے میں،  
دو گز میں گھشتا بنتا ہے۔“

بہت دیر تک بیٹھے رہے۔ کھانے میں دال اور بھنڈی کی بھاجی دیکھ کر لپک  
کر گئے اور ہوٹل کے گلاوٹ کے کباب اور خیری گرم گرم روٹیاں لے آئے۔  
پھر تو احسان خالو صبح شام آنے لگے۔ بیٹھے امی سے باتمیں کیا کرتے۔ کوئی  
کی قیمت کا اندازہ لگانے کیلئے وکیل کی فیس چاہئے تھی۔ پڑوس میں پنڈت جی کبھی  
کسی وکیل کے کارندے رہ چکے تھے۔ دمے کے مرض نے لاچار کر دیا تھا۔ بیٹھے  
کھانا کرتے تھے۔ غزالہ غفورے کو لے کر ان سے ملنے گئی۔

”آداب عرض پنڈت چچا۔“

”اے غزالہ بیٹا، کدھر بھول پڑیں؟ تم نے تو جب سے اسکوں چھوڑا  
سرک پر بھی نظر نہیں آتیں۔ ہم ادھر سے کنی بار گزرے چمن میں بھی نہیں دکھاتی  
پڑیں۔“

”اب چمن ہے کہاں چچا، خاک اڑ رہی ہے!“

”بیکم صاحب تو اچھی ہیں؟“

”جی ادھر ہفتہ بھر سے جی اچھا ہے۔“

اکیلا پن سب سے بڑا مرض ہے بیٹا!“

”احسان خالو آجائتے ہیں، ان کے ساتھ تاش کھیل لیتی ہیں وقت گزر جاتا ہے۔“

”اچھا احسان میاں آنے لگے!“

ان کی عنایت ہے۔ خاندان والے کچھ بھرت کر گئے۔ کچھ دوسرے شروں میں چلے گئے کچھ یہیں بھول یہیں۔“

”یہی زمانے کی ریت ہے بیٹا۔ سنا ہے کوئی بکری ہے۔“

اسی کے بارے میں آپ سے صلاح لینی تھی۔ یہیں ہزار مل رہے ہیں۔ اسی کو پھاڑ پر سینی نوریم بھجوانا ہے۔“

پنڈت جی چپ چلم کریدتے رہے۔“

”مجھے تو کچھ پڑھ نہیں، کیا بھاؤ ہے جائیدار کا پیغام۔“

”حرامی چلے۔۔۔۔۔۔ شما کرنا بیٹا، گندے بول منے سے نکل گئے۔ یہ پکے چور ہیں۔ میں تو خود تمہارے پاس آنے کی سوچ رہا تھا۔ گدھ ہیں بیٹا یہ سارے کے سارے، چاہے وہ کسی دھرم کے چالک ہوں۔ ان کا دھرم بس دھن دولت ہے۔ سنا ہے تمہارے لئے خان صاحب کے بیٹے کی مانگ آئی ہے؟“

”جی؟“

”کوئی بڑا روگ نہیں برص صورت سے بے صورت ہو جاتا ہے۔ چھوت بھی نہیں، پر بیٹا پڑھی در پڑھی چلتا ہے۔ ویسے لاکالائق ہے۔ بڑا دکھی ہے۔“

”ارے شادی بیاہ کی بات بعد میں دیکھی جائے گی۔ چھا زمین کا کیا بھاؤ ہے؟ کوئی کی تو بس دیواریں ہی لیپ پوت کے مرمت ہو سکتی ہے۔ دروازے کھڑکیاں سب گھن گئے ہیں۔ فرش بھی ادھر رہے ہیں۔“

”یہ علاقہ بڑی تیزی سے اوپر چڑھ رہا ہے۔ میری یہ تل بھر کی کوئی کچھ چودہ ہزار لگ پکے ہیں۔ پر مجھے نہیں دیتی۔ میں تو سوچ رہا ہوں پرچون کی دکان

کھول لوں پچھے آنگن سے بھو بیٹے کے لئے الگ کر رہے ہے۔ یہ میری کوٹھڑی سڑک کے کنارے ہے۔ یہ دالان بھی مال سجانے کام آجائے گا۔ سوڈا واڑ کی پیٹی تو صبح و شام منگو اتا ہوں، یہ صندوق میٹھی گولیوں کا بھی ہے۔ بال پچھے لے ہی جاتے ہیں۔ بیٹھا بیٹھا اوپ جاتا ہوں، بھو کا جاپا ہولے تو سوچتا ہوں اس سے میٹھے سیوا درمل کے لڈو بنو کے رکھ دوں۔ بڑی سکھڑ پچھی ہے۔“

”اے ہزاروں دستو ہیں۔ تیل پھیل دغیرہ بسکت۔ خیر، تو بیٹھی سوچ سمجھ کے سودا کرنا۔“

”سامان کے لئے بھیا جی روپیہ لگائیں گے۔“

”اے گلرکی میں پیٹ بھر جائے تو بہت سمجھو۔ پھر بھوکے جاپے میں خرچا ہو گا۔ بیٹا میں تو بینک سے تین ہزار لے رہا ہوں۔“

”بینک سے؟ کیسے لیتے ہیں بینک سے قرض؟“

کی دن چلی چلو رکشا میں میرے ساتھ سب سمجھے جاؤ گی۔“

”کل ہی چلتی ہوں۔ کے بنجے پچھا؟“

”یہ کوئی ساڑھے دس گیارہ بجے بینک کھلتا ہے۔“

“گھونخو”

”جي غزالہ میسی - ”غفورا بولا۔

”کس نے کہا تم گھونچہ ہو؟“

”آپ، ہی کہتی ہیں۔“

”دیکھو آئندہ میں نے گھونچو پکارا اور تم بولے تو تمہاری خیر نہیں سمجھے؟“

۱۰

“کل جمعہ ہے! ”

”جمرات ہے کل تو۔“

خیر پرسوں تمہارے بال کٹانے کا دن ہے۔ اور جمعہ مبارک دن۔ شادوت کا

درجہ بھی نصیب ہوتا ہے جمعہ کے دن۔"

غفورا کچھ نہ بولا۔ مگر نہیں دبانے کے لئے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

"ہاتھ ہٹاؤ!" غزالہ نے ڈانٹ بتائی۔ غفورا کو ہاتھ رکھنے کی ضرورت نہ رہی۔

"کمو---ای ی ی!"

مگر غفورا گم سم کھڑا رہا۔ اس کے بال کافی بڑھ گئے تھے اور ماتھے پر جھک آئے تھے۔ موچھیں بھی اوپر کے ہونٹ پر بھر گئی تھیں۔ ایک دم اس کی پنڈلیوں میں چیوٹیاں سی رینگنے لگیں۔ فضا ایک دم گنگ ہو گئی دور کمیں پن چکی فاختہ کی طرح کپ کپ کپ بول رہی تھی۔ دل کی دھڑکن کے تال سر پر۔

نہ باد صبا نہیں نہ پھولوں کے مہکتے ہوئے تختہ تھے نہ روشن چاند بخلی کے کھبے پر کوئی مر گھلا بیمار کوا او نگہ رہا تھا۔ راستے میں نرم زم گھاس نہیں طبعے اور کوڑے کے ذہیر تھے۔

وہ بوکھلا کر جلدی سے مڑی اور کوئی کے جھولتے ہوئے چھانک کی طرف لپکی۔ مابہ کے ذہیر سے لکرا کر اس کے سینڈل کی ایڑی نکل گئی۔ اور پیر گدے لعاب بھرے گڑھے میں جا پڑا۔

غفورا بے ساختہ عادتاً لپکا۔ اگر منہوس نے اسے کو لیا بھر کر اٹھا لیا تو وہ بھسم ہو جائے گی۔ لیکن وہ نہ سمجھ گیا۔ کچھ سے پیر نکل کر اس نے ساری دنیا سے نفرت کرتے ہوئے ہاتھ اٹھایا۔ غفورا کا گرم کھرو را ہاتھ تھام کروہ کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنا ہاتھ کھینچا۔ اگر غفورا نے اس کا ہاتھ نہ چھوڑا تو؟

مگر غفورا نے جلدی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا مٹھی میں لس سیئے وہ کوئی کے حاطے میں داخل ہو گئے۔



## تیسرا آنکھ

دھول کے بگولے میں لپٹی ہوئی جیپ ناہموار زمین پر ربوکی گیند کی طرح پڑے کھاتی چلی جا رہی تھی۔ ملتے ملتے جوڑ دکھ کر چٹخنے پر آگئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا دل گردے، معدہ اور آنسیں گذندہ ہو کر ایک وزنی آہنی گولہ بن کر زمین کی طرف دھنسی جا رہی تھیں۔ منہ پر ڈھانٹے باندھے ہوئے تھے۔ پھر بھی نہایت نفیس اور باریک کپڑا چھان کی ہوئی ریت حلق میں سینٹ کے پلستر کی طرح لٹھڑی ہوئی تھی۔ پسیخروں میں جیسے دھنکی ہوئی روئی دھنسی ہوئی تھی۔ جو آہستہ آہستہ پھول رہی تھی۔

مگر ایسے دردناک موقع پر بھی کامرڈ گوپال کی صورت دیکھ کر نہیں نہ روک سکی۔ کامرڈ اتنے باریک اور مختصر تھے کہ ہم نے ان کا نام نکار کھ لیا تھا۔ اس اختصار کے باوجود وہ اتنے ضروری بن گئے تھے کہ واقعی ڈوبتے کو تنگے کاسارا ثابت ہوتے تھے۔

معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے انہیں گڑھتے وقت امانت میں خیانت کی تھی اور ان کے حصے کی مٹی ضرور کسی موٹے سینٹ کے ہاتھ بلیک میں پیچ دی تھی۔ جو کچھ لے کر پیدا ہوئے تھے اس میں سے بھی بہت کچھ خور دبرد ہو گیا تھا۔ باہمیں ہاتھ کی انگلی کسی لاٹھی چارج میں سر کا بچاؤ کرنے کی سزا میں کبڑی ہو گئی تھی۔ جب ہاتھ چلا چلا کر باتیں کرتے تو معلوم ہوتا کوئی نازک سی بھارت نائیم کی مددرا پیش کر

رہے ہیں۔ دانت بہت کم اور بے حد دور دور تھے۔ ان اللہ امین کے گئے چنے  
دانتوں کو وہ بڑے انہاک سے نیم کے دتون سے کم از کم روزانہ آدھ گھنٹہ مانجھتے  
تھے۔

مگر اس میں منحصر ہے جسم کے ساتھ دماغ دیو زاد تھا۔ ایک نہیں معلوم ہوتا  
تھا پانچ چھ دماغوں کی بمع پونچی سر میں بھری ہے دین اور دنیا کے کسی بھی اہم مسئلہ  
کے پارے میں پوچھ لجھتے وہ اپنی زندگی میں سے کرید کر جواب تھما دیں گے۔ لوگ  
انہیں بطور ڈکشنری کے استعمال کرتے تھے حالانکہ وہ تھے انسائیکلو پیڈیا۔

ہمارے نور کا تیرا دن تھا۔ النور سے صبح پانچ بجے نکل کھڑے ہوئے تھے۔  
امرا۔ چناندو۔ اور بھوند گیر ہوتے ہوئے شام سے پہلے پہلے چنگاؤں اور سوریا پیشہ  
جانا تھا۔ مگر مجھے تو دیلی گنڈہ کی لگن تھی جو تھانوں کا وطن تھا۔ تھانوںہ پہلا باغی کسان  
تھا جس نے نظام شاہی سے نکری تھی جس نے جسم پر بیالیں زخم کھائے تھے اور  
جس کے بدن میں اتنا خون تھا کہ رام آلم کی ندی لال ہو گئی تھی۔

وہ چودہ میل خون کی لکیر بناتا بھاگتا رہا۔ اس کے پیچھے کتے ہائیتے کانپتے زبانیں  
لپکاتے دوڑ رہے تھے مگر وہ دیلی گنڈہ پہنچ گیا اور چٹانوں کے سلسلے میں گم ہو گیا۔  
پھر آس پاس کے بہت سے نوجوان لاپتہ ہو گئے اور چٹان جی اٹھی۔

جب کامریڈ گوپال نے یہ باتیں بتائیں تب سے گم سم رہ گئے تھے۔ کوئی نہ  
ہسا تھا، مگر اس وقت پھر کتی ہوئی جیپ میں ان کی مشکل دیکھ کر اتنی نہیں آرہی تھی  
کہ منہ پر سے ڈھانٹے پھس کر ریت پھانکنی پڑی۔ کامریڈ قطعی۔ ریت سے کبیدہ  
خاطرنہ تھے۔ نہایت دانت نکو سے ہنسنے ہوئے جیپ کے والہانہ جھٹکوں کے تال پر  
بیٹھے اچک رہے تھے۔ کیا بے ہوہہ جیپ تھی۔ تبھی آگے کبھی پیچھے جھکولتی اور  
آنتوں کی مشق ہو جاتی تو فورا۔ چینترابدل کے آڑی آڑی ملنے لگتی۔

دینیوالی مٹی میں لتھڑے ہوئے ارڈی کے کھیت دیکھ کر مٹکی ہونے لگی۔ کس  
قدر پاچی راستہ تھا کوئی کنوں تک نظر نہیں پہتا۔ دو ایک تکیاں ملیں مگر ان کا پانی  
غور سے دیکھ کر پھر پیاں آنے لگیں۔ اتنے بد وضع اور ڈرایینے والے پہلے اور

موں کیڑے بھجوار ہے تھے کہ توہہ۔

”کامرڈ“ پانی نقصان دہ نہیں۔ ورنہ کیڑے مکوڑے کیسے زندہ رہتے۔ ”کامرڈ“ گوپال نمایت بے تکلفی سے چھپا چھپ ہاتھ مار کے کیڑے مکوڑوں کو ڈرا کے بھا دیتے۔ غب سے گزدی بھر کے دھوتی کا کونہ اس پر منڈہ کے مزے سے غٹ غٹا لی جاتے۔

”شاید آپ لوگوں کو یہ پانی نہ پچھے۔ مگر مجھے تو عادت ہے۔ کل ملا کے انیں برس جیلوں میں گزر برس ہوئی ہے۔“ وہ اکا دکا دانت نکال کر ہنسنے۔ اس شخص کو دیکھ کر چکر آنے لگے۔ ہر وقت ہستی ہوتی شکل، باچھیں بکھری ہوئی۔ ان سے ملاقات کے ڈیڑھ منٹ بعد میری ان سے شدید دوستی ہو گئی۔ راستے بھرا تی باشیں کیس کہ جزڑے شل ہو گئے۔

”یہ چیل سینڈھ ہے نا۔ یہاں پہلے دھان کے کھیت ہوا کرتے تھے۔ اب ارندھی کی کاشت ہوتی ہے۔“ کامرڈ طلب ہو شرمائی تھے۔ تمام گاؤں ॥ انہیں رنے پڑے تھے۔

”کیا یہ لوگ ارندھی کھاتے ہیں؟“ میں نے بل کر پوچھا۔

”نہیں موںگ پھلی بھی ہوتی ہے۔“

”موںگ پھلی کھاتے ہیں اور؟“

”اور ہوا کھاتے ہیں۔“ کامرڈ کھنکھنائے اور مشکل کی صورت میں ٹھنے لگے۔ دھول میں اٹے ہوئے بالکل نیولے کی شکل کے لگ رہے تھے۔ راستے میں جب لاری رکتی لوگ تانگیں سیدھی کرنے اور ادھر ہو جاتے تب کامرڈ گوپال مجھے نمایت رازداری کے انداز میں کہتے۔

کامرڈ کلوك روم؟“ وہ ایک گھنی جھاڑی بتا کر پوچھتے۔

خدا خدا کر کے جیپ منزل مقصود تک پہنچ گئی۔ دور سے ویلی گنڈہ کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوا کسی بچے کے ٹوٹے پھوٹے گھروندے پڑے ہیں۔ ان سے تو چیزوں نیوں کے گھر اور چوہوں کے مل زیادہ آرام دہ اور پاسیدار ہوتے ہوں گے۔ جیپ کو دیکھے

کر لوگ کیڑے کھوڑوں کی طرح بیملا کر نکل پڑے۔ گاؤں والوں کے پاس ان دنوں کوئی کام نہیں تھا۔ کیونکہ ارندیں کی فصل ابھی کچھی کھڑی تھی۔ گھر کا کام کاج کیا خاک ہو گا جب گھر ہی دو بالشت کا ہو۔ پھر بھی عورتیں صحیح تڑکے اٹھ کر سارا گھر لپتی ہیں فرصت سے بیٹھ کر دیواروں پر روز نت نے نقش و نگار بناتی ہیں۔ کپڑے نہیں دھوتیں جسموں پر چھڑے لپٹے ہیں۔ جنہیں لگوٹ کی طرح کس کے پاندھ لیتی ہیں۔ ہر شخص دن میں دو بار نہاتا ہے کیونکہ فرصت میں یہی مشغله سی۔ کبھی ہفتوں میں چولما جلتا ہے درنہ گھر کے کونے میں موگ پھلیوں کے ڈھیر پڑے ہیں۔ جھانکڑ پر بھون کے کبھی پیس کے ذرا سا نمک ملا لیا کبھی یونہی ٹوٹنگتے رہتے ہیں۔ ”اے کھا کر پانی بست نیٹی لگتا ہے۔“ وہ نمک کی چنکلی زبان پر چھڑک کر ایسے چٹمارے لینے لگے جیسے قورمہ تنجن کھارہ ہوں۔

دورے کا چوتھا اور آخری دن تھا۔ تالاب کا پانی ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرنوں کے عکس سے خون کبوتر ہو رہا تھا۔ دل انجانے بوجھ سے بینخا جارہا تھا۔ تالاب کے اس پار چٹانوں کا سلسلہ کپڑے دیو کی طرح سرگمیوں تھا۔

”یہ چٹانیں نہیں ماں کی گود ہیں۔ اس کی چھاتی میں لال چھپے ہیں۔ یوں تو سوئی پڑی رہتی ہیں مگر جب کوئی پناہ گزیں اس گاؤں کی طرف بھاگتا ہے تو یہ بانیں پھیلا کر اسے اپنے سینے سے لگا لیتی ہیں۔ پھر جب اس کی بو سونگھنے کے آتے ہیں تو چونک پڑتی ہیں اور آگ اگلنے لگتی ہیں۔“

کامرٹ گوپال کھانے لگے۔ وہ جب بھی جذباتی ہو جاتے ہیں کھانے کھنکھارنے لگتے ہیں۔ کوئی سمجھے اچھوٹنے سے آنکھوں میں پانی بھر آیا ہے۔

گاؤں میں کوئی زمین دار نہیں رہتا۔ اس کی حویلی کا نام و نشان مت چکا ہے مگر اسی جگہ گاؤں کی سب سے مضبوط اور خوبصورت نمارت پولیس چوکی ہے۔ چٹانوں میں چھپی آتش بازی کا کھون لگانے کے لئے ہیلی کوپڑے بھی کام نہ بنا۔ کالے پتھروں کی گود میں کالے جسم کی شناخت آسان کام نہیں۔

شکاری ہر دم چونکے بندوقیں بھرے پہاڑوں پر نگاہیں جمائے رہتے ہیں۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی پھر کوٹ لیتا ہے اور گولیاں چیننے لگتی ہیں۔

پھر رات گئے کسی جھونپڑی سے بل جھٹی بین کی صدائیں اٹھتی ہیں۔ شکاری فوراً جھستے ہیں مگر اسی دم ساری جھونپڑیوں سے ما تم کی آوازیں بلند ہونے لگتی ہیں اور دھیرے دھیرے پورا گاؤں ما تم کدھ بن جاتا ہے۔ شکاری تھنھلا تھنھلا کر اوھر گرفتاری کرنے لگتے ہیں۔

کون مارا گیا؟

کس کا سماگ اجڑا؟

کس کی مانگ کو آگ لگی؟

کس کی کوکھ جلی؟

کوئی نہیں قبول کیونکہ کوئی نہیں جانتا کہ مرنے والا کس کا پھارا نہیں تھا۔

پھر وہ سپاہی جس کی گولی نشانے پر بیٹھی تھی دوسرے دن کسی جھاڑی کے پیچھے مردہ پایا جاتا ہے۔

ایک نہنی سی کنکری لاہکتی ہوئی میرے قریب سے گزر کر تالاب میں ڈوب گئی۔ میں ایسے چونک پڑی جیسے چنانیں پھٹ پڑی ہوں۔

وہ ڈھلان پر سے بدن سادھے اترتی چلی آرہی تھی۔ دھنڈلے میں اس کا جسم غائب تھا۔ صرف ماتھے پر شیو جی کی تیسرا آنکھ کی طرح اوہنے برابر کم کم کائیک دہک رہا تھا۔

وہ اور قریب آئی اور اس کی مانگ میں سیندور لکیر تکوار کے گھاؤ کی طرح چمکی اس نے کوئے سے مٹکی اتار کر لٹکا لی اور اس کی ڈھیلی ڈھالی چوڑیاں چیننے لگیں۔

وہ دھنڈ لکھ کی ہم رنگ چھوٹی سی لانگ پہنے تھی۔ چولی کارنگ بھی اس کی سیاہ بانہوں میں غائب تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بور بور لٹکوٹی میں بھی وہ ننگی نہیں دکھائی دیتی تھی۔

”ویلی گنڈہ مجھے پاگل بنادے گا؟“ میں نے سسم کر سوچا میں یہ معہ سوچ

سچ کر شل ہو گئی۔ کہ یہ جس کے ماتھے پر ایک فرلانگ سے نظر آنے طکہ سجا ہے اور مانگ سیندھ سے بھری ہے۔ یہ رملیا کی یوہ ہے۔ اس کی سوکھی دلی کلائیوں کی چوڑیاں میرامداق اڑانے کے لئے کھلکھلا رہی ہیں۔

گاؤں کا اکلوتا ذھول پورے زور و شور سے کوٹا جا رہا تھا۔ کانے کی تالیوں کی چھنکار میں کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ رملیا چنگاوں سے دلسن بیاہ کے لارہا تھا۔ بارات بائیں کوس سے چلی آرہی تھی۔ دلسن تو بارہ چودہ میل بعد ہی ہمت ہار بیٹھی۔ اور باری باری ماما جی اور کاکا جی کی پڑھی چڑھ کر آرہی ہی۔ رملیا کا بس چلتا تو وہ خود اسے پھول کی طرح گود میں اٹھا کر لاتا۔ پھر زمین پر نہ دھرنے دیتا مگر شرم اور لحاظ کے مارے وہ اس کی طرف دلیری سے دیکھے بھی نہیں سکتا تھا۔

مگر اپھما اسے مزے سے دیکھے رہی تھی اس کی ٹاک کی نتھنی جھکلوں سے اس کے ہونٹ سلسلہ رہے تھے۔

بڑی دیر تک اودھم مچتی رہی۔ ابلے ہوئے چاولوں کی مرک فضا میں نہ طاری کئے ہوئے تھی۔ چھاج اور رسم کی بالٹیاں لئے ہوئے لوگ ادھر سے ادھر پرستے پھر رہے تھے۔ سارے گاؤں کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ بڑے بڑے جمناں جمائے جا رہے تھے۔ پربت پوجا ہورہی تھی کمن لڑکے اور لڑکیاں رسم اور منشے کی بالٹیاں تھامے دھوتیوں کے پلو میں موگ پھلی اور ابلے ہوئے چاولوں کی گانہیں باندھے بے تکان پھریلی چنانوں پر چڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ویلی گندہ کے پچ آنکھ کھولتے ہی جھوٹی میں مٹھی بھر چاول یا موگ پھلی چھپا کر پھاڑیوں پر بھاگنا سیکھ جلتے ہیں۔ کیونکہ پچ کی جھوٹی میں ایک مٹھی چاول کسی کے دل میں شبہ نہیں پیدا کر سکتے۔

ایک دم بارش شروع ہو گئی۔ دو لہا دلسن کو جملہ عروضی میں پہنچا دیا گیا۔ ساتھ میں گائے بھی کونے میں بندھی ہوئی تھی کہ گائے کو کچھ ہو گیا تو کیا ہو گا۔ رملیا کی ماں بورے کی گوگھی اوڑھ کر دیوار سے ہٹ کر رات بس کرنے میں بیٹھ گئی۔ وہ آج کی رات بھو بیٹھے کے قریب میں ہی رہنا چاہتی تھی کم عمر تا تجربہ کار لڑکا لڑکی کا

کیا بھروسہ، کوئی ایسی بات ہو گئی تو خواہ مخواہ گاؤں کی عورتیں مذاق اڑائیں گی۔  
رملیا کی ماں کو خود اپنی سماگ رات یاد آگئی۔ وہ گیارہ برس کی تھی اور رملیا  
کا پاپا اکیس بیس برس کا لوٹھا تھا۔ ولسن نے اتنا شور مچایا تھا کہ سارا گاؤں ٹھنڈے مار  
رہا تھا اور جب اس نے دو لہا میاں کی کمر کی بوٹی اتار لی تھی۔ تو اسے اتنا مارا تھا کہ  
سماگ رات آخری رات بننے پہنچی تھی۔

مگر اپنے چھاتوں پر بیٹھا ہو شیار تھی۔ سولہواں سال لگنے والا تھا۔ چار کتابیں باخچ لی تھیں۔ دیواروں پر پھول بوٹے بنانے میں طاقت تھی۔ پتہ نہیں یہ علم اس نازک موقع پر کام آتے ہیں کہ نہیں وہ ہمه تن گوش بن بیٹھتی تھی مگر اندر سے سکی کی آواز بھی نہ آئی۔

اگر وہ یوں تن من سے جملہ عروی کی طرف دھیان نہ جوڑے ہوتی تو  
یقیناً اس سائے کو دیکھ لتی جوارندی کے کھیتوں سے نکل کر پیٹ کے بل اس کی  
جھونپڑی کی طرف رینگ رہا تھا۔ وہ اس سے دو قدم پر آکر کتے کی طرح سراخا کر  
ہانپے لگا۔

”کون؟“ بڑھیا نے جھیک کر پوچھا۔

“-----هائلو”

تحانو! جو برس ہا برس سے اسی طرح زخموں سے چور شکاری کتوں سے جاں بچاتا تھا گتا رہا ہے۔ تھانو! جب کیس کوئی واردات ہوتی کسی پولیس چوکی کو آگ لگتی۔ کوئی اناج کی بوچھاڑ لٹتی۔ ہتھیار پار کئے جاتے تب یوں ہی تھانو خون میں نہایا گرتا پڑتا آتا۔ گاؤں والے اسے ہاتھوں ہاتھ اس کے استھان پر پہنچا دیتے۔ جہاں پرندہ پر نہیں مار سکتے۔ جہاں خوف کے مارے شیر دل شکاری کا بھی دم نکلتا تھا۔ پرہیت کی گورنمنٹ ڈومن کی گوز سے زیادہ محفوظ تھی۔

پڑھیا نے جلدی سے اسے گھیٹ کر کوٹھری میں دھکیل دیا اور خود آنکھیں  
مچ کر دبک گئی جب شکاری کتے تمام جھونپڑیوں کا نگا جھاڑا لیتے ہوئے اس تک پہنچے  
تو بڑی دری تک تو وہ گھری نیند کا بہانہ کئے خراٹے لیتے رہی۔ جب اسے دور گھیٹ

کر پھینکا گیا تو جملہ عدی کے مان کا واسطہ دینے لگی۔ ایسے سہلتے تو جانوروں کو بھی نہیں ستاتے۔ انسان تو پھر انسان ہے۔

گودڑی خون سے تر تھی اور دلمنٹ کے نکڑا سے اپنا اچھوتا بدن ڈھانکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”رمیا کہاں ہے؟“

دلمنٹ گونگی بنتی رہی۔ ابھی تو اس کا جسم انجانے لس سے لرز رہا تھا۔ منہ میں زبان کہاں تھی۔

”ٹھی کو گیا ہو گا۔“ بڑھیا غرائی۔

”یہ خون!“

”ٹھو، کیسے نزج لوگ ہو۔“ بڑھیا غرائی۔ ان کے بے ہودہ مذاق پر اس کا سفید سر جھک گیا۔

مگر دیوار اور کھڑکی کی چوکھت تک خون کے فواروں پر شکاری نہایت گندے گندے مذاق کرنے لگے۔

” بتا وہ اسے کہ ہر لے گیا؟“ ایک نے دلمنٹ کا جوڑا پکڑ کر گھینٹا۔ بڑھیا اس کے ہاتھ میں لٹک گئی۔ اور پوپلے منہ سے اس کی کلائی ہخنبوڑنے لگی۔ ایک جھٹکے سے بڑھیا گائے کے قدموں پر جاگری۔

جھپ اندر ہرے میں گولیوں کے تڑاٹے گونختے لگے۔ بڑھیا دیوار سے گھی پھٹی آنکھوں سے اپنی بہو کو دیکھتی رہی۔ گائے سر کو زور سے زور سے جھٹک رہی تھی۔ اس کے گلے میں پڑی گھنٹی کی آواز جھونپڑیوں میں سے اٹھتے ہوئے شور کے اوپر غالب تھی۔

جب دو لاشیں پولیس کی جیپ میں گر کر گئیں تو سارا گاؤں رملیا کے جھونپڑے کے پاس جمع ہو گیا۔ بڑھیا اسی طرح دروازے کے پاس نیک لگائے بیٹھی تھی۔ اپھما اپھا بکھرا ہوا جوڑا سمیٹ رہی تھی۔ بڑھیا کے آنسو خشک تھے۔ ٹھوڑی پر رال بہہ رہی تھی۔

اپھما کی بھی آنکھیں سوکھی تھیں مگر ان میں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔  
جب بڑی بوڑھیوں نے اس کی سماں کی چوڑیاں ٹھنڈی کرنا چاہیں اور  
ماتھے کا سیندور پوچھا تو وہ بھر گئی۔  
”نمیں!“

وہ لمبے چوڑے الفاظ میں یہ نہ کہ سکی کہ شہید مرتے نہیں امر ہو جاتے  
ہیں۔ مگر گاؤں والے سمجھ گئے۔ انہوں نے اس کی مرضی کے آگے ماتھے نکادیئے۔  
اپھما اس منزل پر پنج گئی تھی جہاں جسم کا سماں ختم ہو کر آتا کا سماں بن جاتا  
ہے۔

دوسرے ہی دن تین پولیس چوکیوں کو آگ لگائی گئی۔ سولہ بندوقیں اور دو  
پیٹیاں کارتوسون کی لوٹ لی گئیں۔ مختلف گاؤں سے لگ بھگ تین سو نوجوان  
پاڑیوں کی گود میں جا چھپے۔ کوئی دن ہی ایسا جاتا ہو گا جو یہ چھاپ مارنا طبقہ بند نہیں  
کرتے۔ چشم دید گواہوں کا بیان ہے کہ ان کے گروہ میں سب ہے آگے ایک کالی  
نجگنگ بلا ہوتی ہے جس کے ماتھے پر تیری آنکھ ہے جس میں سے چنگاریاں چختی  
ہیں۔

”اپھما“ میرے گھلنے میں اچھو پڑنے لگا۔ اور کامریڈ گوپال زور زور سے  
کھنکھارنے لگے۔

وہ مگری بھرے مری اور ڈھلان کے اوپر چڑھنے لگی۔  
مگر اس کی تیری آنکھ میرے دل میں اترتی چلی گئی۔





صست کے افلاں گویا ہورت کے دل کی طرح پر جمع اور دشوار گزار  
نظر آتے ہیں۔ مجھے یہ افلاں اس جوہر سے تقابل معلوم ہوتے ہیں جو  
ہورت میں ہے۔ اس کی روح میں ہے۔ اس کے دل میں ہے۔ اس کے  
ظاہر میں ہے، اس کے ہامن میں ہے۔

(کرشن چندر)

صست کی شخصیت اردو ادب کے لئے بعثت فخر ہے۔ انہوں نے بعض  
الکی پرانی فصیلوں میں رخنے والے ہیں۔ کہ جب تک وہ کمری تھیں،  
کئی رستے آنکھوں سے او جمل تھے اردو ادب میں جو امتیاز صست چھٹائی  
کو حاصل ہے، اس کا منکر ہونا کچھ بینی اور بخل سے کم نہ ہو گا۔

(پدرس بخاری)



**RHOTAS BOOKS**

Ahmed Chambers 5 Temple Road Lahore

Rs. 45/-